پیامِ عشق

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری کے مضامین کا اِنتخاب

پیامِ عشق

(مجموعۂ مضامین و تقاریر)

ڈاکٹر سیّد عالم خوندمیری مرحوم

سابق

صدر شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

مُرتّبہ

حضرت سیّد خدا بخش خوندمیری میاںجی صاحب

سجّادہ دائرہ نو

ناشر

حکیم سیّد عیسیٰ خوندمیری

(اہل دائرہ نو)

کتابت ---------- الحاج سید اشرف صاحب مہدوی

سرورق ---------- جناب سید محمود طالب خوندمیری صاحب
(آرکٹکٹ)

طباعت ---------- نیشنل پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد

ناشر ---------- حکیم سید علی خوندمیری (اہل دائرہ)

ملنے کا پتہ ---------- ۱۶-۴-۷۵، نیا دائرہ۔ چنچل گوڑہ
حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۲۴۔ آندھرا پردیش

اشاعت بار اول ---------- جنوری ۱۹۸۴ء ---------- ایک ہزار

قیمت :۔ دس روپے

انتساب

اُن طالبانِ حق کے نام
جنکی راہیں بوئے عشق سے معطّر

اور

جن کی منزل دیدارِ الٰہی

○

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(حافظ شیرازیؒ)

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان
۱	عرض ناشر ---------- حکیم سیّد عیسیٰ خوندمیری
۳	پیش لفظ --------- جناب محمد قادر خاں صاحب (بی. ایس سی)
۷	تعارف -------- جناب مالک رام صاحب (صدر کل ہند اردو اکاڈیمی دہلی)
۱۵	خاندانی پس منظر، خاکہ اور تاثر ------ حضرت سیّد خدا بخش خوندمیری میاںجی صاحبؒ (دائرہ نو)

مضامین و تقاریر

صفحہ نمبر	عنوان
۲۸	ذات رسالت مآبؐ سے ربط کا تاریخی مفہوم --------------
۳۱	ولایت و نبوت، عالم اسلام کی ایک دیرینہ بحث --------------
۳۷	مہدویت۔ تعبیر اسلام ——— (تقریر) --------------
۵۳	انسانی شخصیت، قرآنی دعاؤں کی روشنی میں --------------
۶۱	مسلک عشق ——— (تقریر) --------
۷۰	سفر، آغاز اور منزل --------------------
۷۲	متبادل نظام اقدار کی ضرورت ------------------
۷۶	ایک بات ----------------------
۸۲	ایک خط ----------------------
۸۸	افکار پریشاں ----------------------
۹۳	ایک مکالمہ ----------------------

صفحہ نمبر	عنوان
۹۹ - ۱۰۸	کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا : ----------------

بسم اللہ الہادی

عرضِ ناشر

وحید العصر ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کے اٹھ جانے کے بعد جس بات کا شدت سے احساس ہوا وہ یہ کہ کسی ایک مستقل موضوع پر ان کی تصنیف، ان کے اپنے علم و فکر کے اثاثہ کے طور پر باقی نہ رہ سکی۔ برخلاف اس کے گوناگوں مسائل پر متعدد مضامین بکھرے پڑے رہ گئے۔ جن کو اکٹھا کرنا اور پھر ترتیب دینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

پہلے مرحلہ میں، پیر و مرشد حضرت میاں سید خدابخش خوندمیری میانجی صاحب (دائرہ نو) نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ مختلف پرچوں سے مضامین اکٹھا کئے۔ نیز کل ہند مہدویہ کانفرنس، گجرات کے موقع پر سنہ ۱۹۶۶ء میں کی گئی تقریر کے حصول کیلئے پالن پور، گجرات کا سفر بھی کیا۔ مختصر یہ کہ دلچسپی، شوقِ خدمت اور تڑپ و لگن کے ساتھ اس کام میں منہمک ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں آج "پیامِ عشق" آپ کے اور ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کا شمار، بلاشبہ منفرد علماء میں ہوتا ہے۔ یہ ضروری اور قطعی نہیں ہے کہ ایک عالم کو "دارالعلوم دیوبند" یا "جامعہ نظامیہ" وغیرہ ہی سے سندِ علم دی جائے۔ کیوں کہ علماء یا عالم کے معنے اور مراد صرف "اہلِ علم" ہی کے ہوتے ہیں۔ اور ڈاکٹر عالم مرحوم، علمِ جدید و قدیم ہی کے نہیں بلکہ مذاہبِ عالم کے نہ صرف عالم تھے بلکہ ان سب کا نہایت درجہ گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ اور پھر سارے مذاہب کی روح اور ان کے مقصودِ اصلی سے واقفیت رکھتے تھے۔

پیر و مرشد قبلہ گاہی کے پیشِ نظر اور ارادوں میں یہ بات داخل تھی کہ "ڈاکٹر عالم خوندمیری میموریل لائبریری" کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کمیٹی کو طباعت و اشاعت کی ذمہ داری بھی سونپ دی جائے۔ لیکن اس خصوص میں ابھی کچھ مراحل طے ہونا باقی ہیں۔ پس، احقر کے نام، بحیثیت ناشر قرعۂ فال

نکل آیا جس کے لئے میں حضرت قبلہ کا ممنون ہوں۔

احقر بطور خاص جناب مالک رام صاحب صدر کل ہند اردو اکاڈیمی دہلی۔ جناب الحاج محمد قادر خاں صاحب (سابق صدر مرکزی انجمن مہدویہ حیدر آباد) اور عزیزم سید محمود طالب خوندمیری کا ان کے اپنے حدِ امکان تعاون کے سبب بے حد مشکور ہے۔ نیز ان مرشدین کرام اور برادران قومی و اہل قلم ارباب علم و دانش کا بھی شکر گزار ہوں، جنھوں نے اپنے احساسات کو قلمبند کر کے حوالہ کیا، جو کتاب میں شامل ہیں۔

احقر حکیم سید عیسیٰ خوندمیری غفرلہٗ
(اہل دائرہ نو)

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ
۲۳ جنوری ۱۹۸۴ء۔ دوشنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

آج وہ کل ہماری باری ہے　　موت سے کس کو رستگاری ہے

انسان کی پیدائش ہی اس کے وصال کی پیشین گوئی ہے۔ کسی کا ہم سے جدا ہو جانا قدرت کا ایک اٹل فیصلہ ہے جس سے کسی صورت فرار نہیں۔ ایسی صورتمیں اظہار رنج و غم کچھ بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ بات بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ اگر ہماری کوئی عزیز شئے کھو جاتی ہے تو فطری طور پر ہم اس پر رنج و افسوس کرتے ہیں۔ ذہن سکون سے خالی ہو جاتا ہے اور دل ایک ناقابل بیان بوجھ کو محسوس کرتا ہے۔ یہ لوازمات فطرت ہیں اور انسان باوجود عقل و ہوش رکھنے کے یہاں خود کو مجبور پاتا ہے۔ ایسا ہی حال اس وقت بھی ہوتا ہے جب ہم کسی ایسے شخص اور فرد کی موت کی خبر سنتے ہیں جس کیلئے ہمارے دل میں جگہ ہوتی ہے جو ہمارے لئے کسی نہ کسی وجہ سے محبوب ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید عالم خوندمیری صاحب کے انتقال کی اطلاع پر بلا شبہ ہم سب ملول اور رنجیدہ تھے۔ شخصی طور پر میں اس کا حامی ہوں کہ ان کی جدائی ہمارے لئے ایک حادثہ سے کم نہیں ہے۔ عالم صاحب جیسے دو چار نہ سہی ایک آدھ فرد بھی ہم میں موجود ہوتا تو شاید اس حادثہ کی سنگینی کچھ کم ہوتی اور جدائی کا رنج قدرے کم ہوتا جو اٹھ رہا ہے اس کا بدل ہمکو نہیں مل رہا ہے۔ بحر العلوم علامہ سید اشرف شمسی رح حضرت مولانا سید شہاب الدین رح مولانا محمد سعادت اللہ خانصاحب ہندوزی رح۔ مولانا سید مرتضیٰ صاحب رح اور ابھی حال ہی میں حضرت ابو سعید سید محمود صاحب رح جیسے بلند پایہ ادیب عالم ہم سے اس صدی کے دوران جدا ہوئے ہیں ان کا بدل ہمیں نہیں مل سکا۔ اب عالم صاحب کی موت سے ہمارا رہا سہا سہارا بھی چھوٹ گیا۔

جناب ڈاکٹر سید عالم خوندمیری صاحب ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جہاں سے سینکڑوں تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ مولانا محمد سعادۃ اللہ خانصاحب ہندوزی کامل و متکلم سابق رکن دائرۃ المعارف عثمانیہ اور قاید ملت

نواب محمد بہادر خاں بہادر یار جنگؒ نے یہیں زانوئے ادب طے کیا تھا۔ خاندانی فضیلت کے ماسوا جہاں تک سندی علم کا تعلق ہے انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے اولاً فلسفہ سے پھر عربی اور فقہ سے ایم۔اے کی اسناد حاصل کیں اور پھر وہیں تدریس سے وابستہ ہو گئے لیکن ان سب سے بڑھکر جو چیز انہیں اپنوں اور پرائیوں میں منفرد اور ممتاز رکھتی تھی وہ ان کی گہری نظر، وسعت مطالعہ۔ مذاہب عالم اور خاص طور پر تصوف میں ان کی مہارت تامہ ہے جس سے ہر وہ شخص متاثر ہوا ہے جسے ان کے ساتھ بیٹھنے گفتگو کرنے اور ان کی تقاریر سننے کی مسرت حاصل رہی ہے۔ ان کے تعلق سے یہ بات مشہور تھی کہ وہ لکھتے کم ہیں اور جب لکھتے ہیں تو فکر و فن کے گوہر بکھیرتے ہیں۔

جو شخص بہت کم لکھنے کا عادی ہو اس کی تحریرات کو جمع کرنا یقیناً جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ قابل صد مبارکباد ہیں وہ لوگ جنھوں نے ان کی تحریرات کو جمع کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ جہاں لگن ہو۔ دلچسپی ہو۔ شوق و تڑپ ہو وہاں راستہ کی رکاوٹ مانع نہیں ہوتی۔ ان کی محنت کا ثمرہ اگلے صفحات پر آپ خود ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود پڑھنے کے بعد محسوس کریں گے کہ فکر و فن کے کیسے کیسے نایاب گوہر انہوں نے اپنی تحریروں میں چھوڑا ہے۔ مشتے از خروارے کے بمصداق چند ایک اقتباس آپ کی توجہ کے طالب ہیں :-

> "ہر سال میلاد مہدی موعود علیہ السلام کا اہتمام ہوتا ہے رسالے بھی نکلتے ہیں لیکن صورت حال یہ ہے کہ ہر ہاتھ میں جام شریعت نظر آتا ہے لیکن امام علیہ السلام کی دعوت عشق سنائی نہیں دیتی۔ احیائے شریعت کی آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ بیچارہ عشق اس آواز میں دب جاتا ہے۔"

مقصود دین سے بحث کرتے ہوئے ایک موقعہ پر عالم صاحب لکھتے ہیں :-

> "اگر ہمارے اعمال وہی ہوں جو رسول اللہ کے اعمال تھے اگر ہمارا طرز بھی وہی ہو جو رسول اللہ کا طرز تھا لیکن دل اس آگ سے خالی ہو جو رسول اللہ کے دل میں منور تھی ہمارے دل اس نور سے محروم ہوں جو رسول اللہ کے دل میں موجزن تھا تو کیا ظاہری

اعمال ہمارے دین کو مکمل کر دیں گے مقصودِ دین یہ ہے کہ انسان اپنے دلوں کو اس آگ سے منور کرنے کی کوشش کرے۔ اس آگ کو پیدا کرنے کی کوشش کرے جو رسولؐ کے قلب میں موجزن تھا اور موجود تھی۔ اس اضطراب کو پیدا کرنے کی کوشش کرے جو رسول کے قلب میں موجزن تھا اور اپنی زندگی کا اپنے دین کا مقصد اس لمحہ کو بنائے جو رسول اللہ کی زندگی کا اعلیٰ ترین لمحہ تھا۔ وہ لمحہ جب رسول کے سامنے سے وہ تمام پردے ہٹے جو خالق کو مخلوق سے جدا کرتے ہیں۔"

صاحب شواہد الولایت نے "طلبِ دیدارِ خدا" کی فرضیت کے تعلق سے جو نقل تحریر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام نے تمام خلائق خاص و عام کو یہ حکم سنایا کہ ہر ایک مرد و عورت پر دیدارِ خدا کی طلب فرض ہے اس سلسلہ میں عالم صاحب لکھتے ہیں: ۔

"اگر انسان اپنی مذہبی، اپنی اخلاقی زندگی کا منتہا اور مقصود رسول اللہ کے اس اعلیٰ ترین لمحہ کو بنانے کی کوشش نہ کرے تو پھر اس کا مذہب چند مسلمات، چند قوانین چند اصولوں کا نام ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ اصول اور یہ مسلمات یا قوانین زندگی میں وہ انقلاب پیدا نہیں کر سکتے جو انقلاب رسول مقبول کی زندگی میں پیدا ہوا تھا وہ انقلاب جو رسولؐ نے تاریخ میں پیدا کیا۔"

ایک اور جگہ تعلیمات امام مہدیؑ کے تعلق سے انہوں نے کتنی پیاری بات کہی ہے: ۔

"قرآنِ مجید کے ہر حکم کو امام علیہ السلام نے فرض قرار دیا۔ ان کو بھی جنھیں پچھلے صاحبانِ شریعت فرائض پنجگانہ سے کم تر ٹھہراتے تھے انھیں بھی فرض قرار دیا کسی فرض کا اضافہ نہیں کیا صرف قرآن فہمی کی دعوت دی اور بس۔"

"دعوت مہدیت" پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ۔

"یہاں دید کی طلب ہے مشاہدۂ حق کی بے تابی ہے اور یہی طلب اور بے تابی ایک طرف تو تزکیۂ نفس کی جانب رہنمائی کرتی ہے تو دوسری طرف ایک والہانہ انداز میں دنیا سے انسان کو بے نیاز بنا دیتی ہے۔ بے نیازی مقصد نہیں اور نہ منزل ہے بلکہ نتیجہ ہے

بے تابانہ طلبِ دید اور مشتاقی کا۔ بے نیازی جس کا انجام ترک ہے سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ نہیں بلکہ ذوقِ دید کا آفریدہ ہے۔ یہ دنیا سے ایک دنیا بیزار کا فرار نہیں بلکہ طالب کے آگے کی جانب اور بلندی کی منزل تک سفر کے عزم کا نتیجہ ہے دنیا نظروں سے غائب ہونے لگتی ہے اس لئے فرار کا سوال کہاں یہ تو ایک سفر ہے جس کا انجام اور جس کی منزل ذات ہے اور پھر یہ بھی کہ ذہن میں نہ شک ہے اور نہ الجھن یہ ترک "جان و دل را جانب دلدار کن" کے مطالبے کا جواب ہے۔

مزید اقتباسات دینے سے میں نے عمداً احتراز اس لئے کیا ہے کہ قاری کا تجسس اور لطف باقی رہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی قبر کو اپنی رحمت سے معمور کرے اور انہیں دیدار کی لذتوں سے سرفراز کرے۔ آمین

احقر العباد

محمد قادر خاں

(پی۔ ایس سی)

ادیب و نقّاد، ماہرِ غالبیات

جناب مالک رام صاحب

تعارف

ڈاکٹر سیّد عالم خوندمیری کے نام میں 'خوندمیری' ان کی خاندانی نسبت ہے، ان کے جدِ اعلیٰ حضرت بندگی میاں سیّد خوندمیر صدیق ولایتؓ کی طرف۔ سید خوندمیر نسل میں سے تھے، امام سابع حضرت موسیٰ کاظم کے۔ وہ حضرت علی کرّم اللہ وجہٗ سے ۱۹۔ ویں پشت میں تھے۔ ان کے آباء و اجداد سمرقند (بخارا) سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ پہلے باڑی بیانہ اور پھر گجرات کے علاقہ نہروالہ پٹن میں مقیم ہو گئے۔ ان لوگوں کو سلطنتِ گجرات میں مناصبِ جلیلہ عطا ہوئے۔ سیّد خوندمیر کے والد سیّد موسیٰ کا نکاح ملک محمود شاہ بن ملک یعقوب صوبیدار پٹن کی دخترِ نیک اختر بوتاج سے ہوا تھا۔ ان کے دو بیٹے ہوئے سیّد خوندمیر اور سیّد عطاء اللہ۔ سیّد خوندمیر ۸۸۶ ہجری (۱۴۸۱-۱۴۸۲ء) میں پیدا ہوئے۔ سیّد عطاء اللہ ان سے سات برس چھوٹے تھے (ولادت ۸۹۳ ہجری)

سیّد خوندمیر کی طبیعت میں بدو شعور سے انقطاع اور استغناء کی کیفیت تھی۔ ان کے والد سیّد موسیٰ کی وفات کے بعد فرمانِ سلطانی ہوا کہ ان کا بڑا بیٹا اور وارث ہونے کی حیثیت سے سیّد خوندمیر کو خلعت دیا جائے۔ صوبیدار پٹن نے سید خوندمیر کو حکمِ سلطانی سے آگاہ کیا۔ سیّد خوندمیر نے خلعت لینے سے معذرت کی۔

اِن کی افتادِ طبع دیکھتے ہوئے ان کے بزرگوں نے چاہا کہ یہ کسی اہل اللہ کی بیعت کر لیں اور اس مقصد سے وہ انھیں دو تین مشہور حضرات کی خدمت میں لے گئے لیکن ہر جگہ

سیّد خوندمیر نے بیعت کرنے سے اجتناب کیا اور کہا کہ یہ سب حضرات دنیادار ہیں، انہیں سے کوئی بھی میرے لئے منزلِ مقصود تک پہونچنے کا وسیلہ نہیں بن سکتا۔

——— یہ صورت حال تھی کہ حضرت سیّد محمد جونپوری پٹن تشریف لائے۔ حضرت سیّد محمد نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا جہاں کثیر لوگوں نے ان کے دعوے کی تصدیق کی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی، وہیں علمائے عہد نے ان کی صداقت سے انکار کیا، اور حکومتِ وقت سے شکایت کی کہ وہ عوام النّاس کو گمراہ کر رہے ہیں۔ نیز یہ کہ ان کی روز افزوں مقبولیت اور ہر دلعزیزی خود حکومت کیلئے خطرہ کا موجب ہے۔

——— کسی حکمران کے لئے اس سے زیادہ تشویش کی بات نہیں ہو سکتی کہ اس سے کہا جائے کہ آپ کی گدّی خطرے میں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی گدّی بچانے کی خاطر ہر طرح کا اقدام کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ ان علماء نے حکمرانوں سے یہ کہکر کہ سیّد محمد کی ذات سے ان کا تخت معرضِ خطر میں ہے گویا ان کی دکھتی رگ پر انگلی رکھدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہاں بھی گئے، ان کے وعظ و تذکیر اور ان کے ذاتی زہد و ورع کے باوجود وہاں کے حکمران نے انھیں اپنے ہاں ٹھیرنے کی اجازت نہ دی اور انھیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا۔

——— دراصل وہ پناہ ہی کی تلاش میں اب پٹن بھی پہونچے تھے خبر ملنے پر سیّد خوندمیر بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بلا تامل ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔

——— بالآخر حضرت سیّد محمد کو پٹن سے بھی نکلنا پڑا۔ وہ بڑلی پہونچے اور یہاں انھوں نے صراحت سے پھر مہدیت کا دعویٰ کیا، اور لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دی۔ یہیں سیّد خوندمیر بھی پٹن سے آکر ان کے ہمراہ ہو گئے۔

——— حضرت سیّد محمد مہدی پٹن سے خراسان کے قصد سے روانہ ہوئے تھے۔ چنانچہ بڑلی سے جالور، ناگور، جیسلمیر، ٹھٹہ، کاہہ سے گزرتے ہوئے وہ فراہ پہونچے، جو قندہار سے دس منزل پر ہے۔ یہیں فراہ میں دوشنبہ ۱۹ ذی قعدہ ۹۱۰ ہجری (۱۴ اپریل ۱۵۰۵ء)

واصل بحق ہوئے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ فرّاہ کے باہر قریہ رچ کے راستے پر مدفن ہے۔

حضرت سید محمد جونپوری کی مختلف بیویوں سے متعدد اولادیں تھیں۔ ان کی سب سے پہلی بیوی بی بی الٰہ دادی ان کے چچا سید جلال الدین کی دختر نیک اختر تھیں۔ ان کے بطن سے ان کے دو بیٹے (سید محمود اور سید اجمل) اور دو بیٹیاں (بی بی خونزا گوہر اور بی بی خونزا فاطمہ) ہوئیں۔ بی بی فاطمہ کا نکاح ملک برہان الدین سے ہوا تھا۔ ملک برہان الدین کے انتقال کے بعد وہ سید خوندمیر کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ سید خوندمیر کی دوسری بیوی تھیں۔

سید خوندمیر نے حضرت سید محمد مہدی کے مشن کو جاری رکھا اور اس راہ میں تمام مصائب اور صعوبتیں ان کے حصے میں بھی آئیں، جن کا شکار عمر بھر ان کے ہادی اور مرشد رہے تھے۔ بالآخر سید خوندمیر بھی عین الملک کی فوج کے ہاتھوں ۱۴ شوال ۹۳۰ ہجری (۱۵ اگست ۱۵۲۴ء) سدارسن (گجرات) کے مقام پر شہید ہوئے۔

سید خوندمیر کے دوسری بیوی سے دو بیٹے ہوئے۔ بڑے سید محمود اور چھوٹے سید اشرف (جن کا شیر خواری کے ایام میں بعمر نو ماہ انتقال ہوگیا)۔ ہمارے سید عالم خوندمیری انھیں سید محمود سے بارہویں پشت میں تھے۔

سید عالم خوندمیری کے والد کا نام حضرت میاں سید میراں خوندمیری تھا۔ ان کا دوسرا نکاح پروفیسر سید اشرف صاحب شمسی ید اللّٰہی (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) کی صاحبزادی شمس النساء (عرف ماں صاحبہ بی بی) سے ہوا تھا۔ سید عالم منگل ۹ جمادی الآخر ۱۳۴۰ ہجری (۷ فروری ۱۹۲۲ء) حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ کنیت ابو اسمٰعیل دی گئی تھی۔

حسبِ دستور چار برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ آپ کے نانا نے پہلا سبق پڑھایا اس کے

بعد انھیں کی نگرانی میں گھر پر اردو، انگریزی اور ریاضی کی تعلیم شروع ہوئی۔ عربی مولوی ابوالعائذ سید احمد منوری سے پڑھنا شروع کی۔ جب یہ دور ختم ہوا تو باقاعدہ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ بتدریج میٹرک (۱۹۳۷ء)، انٹر (۱۹۳۹ء) بی۔ اے (۱۹۴۱ء) اور ایم۔ اے (۱۹۴۳ء) کی اسناد حاصل کیں۔ اس کے بعد وکالت کے نصاب (ایل ایل بی) میں داخلہ لیا تھا، لیکن کسی وجہ سے اسے ترک کرنا پڑا۔ تعلیم کے دوران میں فلسفہ ان کا دل پسند موضوعِ مطالعہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے خاندانی پس منظر کے باعث مذہب سے بھی خاص شغف تھا۔ چنانچہ مولانا سید شہاب الدین سے حدیث و فقہ اور مولانا سید شاہ قطب الدین صابری (سابق امیر جماعت نظامیہ) سے تفسیر قرآن پڑھی تھی۔ یہ انھیں رجحانات کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے "اقبال کا تصورِ زماں و مکاں" کے موضوع پر مقالہ قلمبند کیا اور عثمانیہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند لی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد روزگار کا مرحلہ سامنے آیا۔ اور قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ انھیں جائے پناہ ملی تو کہاں ملی، حیدرآباد اسٹیٹ بنک میں! ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں بنک میں عارضی طور پر بھرتی ہو گئے۔ گویا ہیگل اور کانٹ اور برگساں کے فلسفے کا طالب علم، اور اقبال کے فلسفۂ زماں و مکاں کی موشگافیوں کا نقاد۔ بنک کے بہی کھاتے کا شکار ہو گیا۔ بھلا، اس کاروبار میں دل لگتا، تو کیونکر! قدرت بھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے لشتم پشتم ڈھائی تین برس تو نکالے اور تنگ آ کے کوئی اقدام کرنے ہی والے تھے کہ اگست ۱۹۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی نے انھیں دعوت دی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ اگلے دو مہینے بنک کی ملازمت سے الگ ہونے کی رسمی کارروائی میں گذر گئے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں یہاں سے سبکدوش ہو کر وہ آرٹس اینڈ سائنس کالج، ورنگل میں معلم (لیکچرر) بن کر چلے گئے۔ اس کے بعد بالترتیب سٹی کالج اور نظام کالج حیدرآباد میں تبادلہ ہو گیا۔ اور بالآخر ۱۹۶۲ء میں آرٹس کالج، عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرری ہوئی جہاں درجہ

بدرجہ ریڈر اور پروفیسر بنے۔ اور یہیں سے ۱۹۸۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

——— سیّد عالم خوندمیری مرحوم کو شروع سے سیاست سے شغف رہا۔ اور اس میں ان کا میلان روزِ اوّل سے یساری گروہ کی طرف تھا۔ وہ ۱۹۳۹ء میں نظام ریلوے ملازمین کی یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں آلوین میٹل ورکس یونین کے صدر وہ حیدرآباد ریاست میں ٹریڈ یونین تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک "کامریڈ ایسوسی ایشن" کی بھی داغ بیل ڈالی۔ ریاست میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام میں بھی وہ برابر کے شریک تھے۔ وہ تلنگانہ تحریک کے بھی سرگرم کارکن رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی لمبے عرصے تک وابستہ رہے۔ اور اس دوران میں قید و بند تک نوبت پہنچی۔ بہرحال یہ ہیجانی دور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک صرف چار برس رہا۔ اس کے بعد کمیونسٹوں سے اختلافات کے باعث وہ عملی طور پر تو سیاست سے الگ ہوگئے، لیکن نظریاتی لحاظ سے ان کا رویہ اور ضابطۂ حیات یساری ہی رہا۔ اس کے لئے انھوں نے مارکسین (MARXIAN) کی اصطلاح وضع کی تھی جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ وہ مارکس کے فلسفۂ حیات سے تو متفق ہیں، لیکن وہ مارکسٹوں (اور کمیونسٹوں) کے طریقۂ کار کے مخالف ہیں۔

——— سیّد عالم خوندمیری کے گھرانے میں علم و فضل اور رشد و ہدایت کی روایت بہت پرانی تھی۔ ان کے دادا مشہور عالم مولانا سیّد عالم تھے۔ وہ ۱۲۴۳ ہجری (۱۸۲۷-۱۸۲۸ء) میں بمقام ہستیڑا (ریاست جے پور) میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ان کے والدین کا مستقل قیام حیدرآباد میں تھا، وہ بھی ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد حیدرآباد آگئے۔ یہاں انھوں نے دارالعلوم میں رہ کر ۱۲۷۸ ہجری (۱۸۶۱ء - ۱۸۶۲ء) میں سندِ تکمیل حاصل کی اور پھر یہیں مدرس مقرر ہوگئے۔ حیدرآباد کے متعدد رؤسا و امرا ان کے شاگرد رہے۔

۱۹ شعبان ۱۳۱۳ ہجری (۴ فروری ۱۸۹۶ء) بعمر ۷۰ سال رحلت کی۔

——— سید عالم کے والد سید میراں خوندمیری کی ساری عمر محکمۂ تعلیمات میں گذری۔ وہ ناظرِ تعلیمات کے عہدے سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کا ۴ صفر ۱۳۶۸ ہجری (۱۶ ڈسمبر ۱۹۴۸ء) کو انتقال ہوا۔

——— سیّد عالم خوندمیری کے نانا بحر العلوم علامہ سید اشرف شمسی یداللّٰہی تھے۔ وہ فارسی اور عربی کے زبردست عالم اور منتہی تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۵ صفر ۱۲۸۰ ہجری (۲۲ جولائی ۱۸۰۳ء) ہے اور تاریخ وفات ۳ محرم ۱۳۴۹ ہجری (۳۱ مئی ۱۹۳۰ء) وہ پہلے دارالعلوم، حیدرآباد اور اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے فارسی اور عربی میں گرانبہا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے جن میں تفسیر "لوامع البیان" (عربی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

——— سیّد عالم خوندمیری ان بزرگوں کے نام لیوا اور خلفِ ارشد تھے۔ مذہب اور فلسفہ اور تصوّف گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اس پر انگریزی تعلیم نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ سیاست اور مذہب و تصوّف اور اقبال ان کے دلپسند موضوع تھے۔ بلا مبالغہ انھوں نے بیسیوں کانفرنسوں اور سمیناروں میں مقالے پڑھے۔ ان کانفرنسوں میں انھیں خطاب کرنے کی دعوت دینا ہی اس بات کا اعتراف ہے کہ اہلِ علم و نظر ان کے خیالات کی گہرائی اور مطالعے کی وسعت جانتے ہیں، اور ان کی قدر کرتے ہیں۔

——— لیکن ان کے صلہ و ستایش سے استغناء کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی کوئی کتاب یا مضامین کا مجموعہ شائع نہیں کیا۔ مجھے کئی سمیناروں اور جلسوں میں ان کے مقالات سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے انھیں ہمیشہ ایک ہی وضع پر دیکھا: بکھرے لمبے لمبے بال، صاف ستھرا لیکن بے تکلفانہ لباس، اکھڑا اکھڑا گفتگو کا انداز، سامعین کی رائے سے بے نیاز۔ میں انھیں قلندر کہا کرتا تھا۔ عجیب بے ہمہ اور باہمہ قسم کے شخص تھے وہ۔

——— ان کی قلندری کا ایک واقعہ سنئے، جو مجھے ان کے بھانجے اور مرشد مولانا سیّد خدا بخش

خوندمیری مدظلہٗ نے بتایا :

——— مولوی ابوالحسن سیّد علی صاحب مرحوم، سیّد عالم خوندمیری کے خسر تھے۔ وہ نظام آصفجاہ سابع میر عثمان علی خاں مرحوم کے درباری اور بڑے بارسوخ شخص تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر عالم خوندمیری اپنی سیاسی اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں منہمک تھے۔ قدرتاً نظام ان تحریکوں سے پریشان تھے۔ انھوں نے مولوی ابوالحسن سے شکایت کی کہ آپکا داماد ایسی "خلافِ قانون" تحریکوں سے وابستہ ہے۔ مولوی ابوالحسن نے چاہا کہ یہ حضور نظام کی خدمت میں حاضر ہوں اور مناسب الفاظ میں معذرت کرلیں، تاکہ میر عثمان علیخاں کے دل میں کوئی شبہ نہ رہے۔ مولوی ابوالحسن کے اصرار پر بہت لیت ولعل کے بعد ڈاکٹر سیّد عالم نے نظام مرحوم کی خدمت میں سلام کے لئے حاضری دینا منظور کرلیا۔ سیّد عالم پہنچے اور آدابِ شاہی کو بالائے طاق رکھ کر نظام کے قریب جاکر ملنبد آواز سے کہا: السّلام علیکم۔ نظام نے مولوی ابوالحسن سے پوچھا "ارے ابوالحسن، یہ کس کو تو ساتھ لایا ہے؟" مولوی صاحب نے مؤدبانہ عرض کیا: "حضور، یہ علامہ شمسی مرحوم کا نواسہ اور غلام کا داماد ہے۔" نظام نے کہا: "ہاں شمسی صاحب کا نواسہ "السلام علیکم" ہی سیکھ اور کہہ سکتا ہے۔" پھر ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہوکر کہا: ارے، یہ مزدوروں کا کیوں ہمدرد بن گیا ہے؟" عالم صاحب نے جواب دیا: "حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدور کے ہاتھ کو بوسہ دیا تھا۔ پس غلامِ رسول بھی اُن سے ہمدردی رکھتا ہے۔" موقع شناس نظام نے بہت خوشدلی اور فراخ دلی سے واہ، واہ کی اور رخصت کردیا۔

——— پچھلے دو تین برس بیماری ہی میں گزرے۔ ۱۹۸۲ء کے اواخر اور ۱۹۸۳ء کے شروع میں ایک سمینار میں شریک ہونے امریکا گئے اور وہاں سے کنیڈا پہنچنے تک سخت علیل ہوگئے۔ گردوں نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر مئی میں وہاں سے واپس آئے۔ توقع تھی کہ

شائد مرض میں کچھ افاقہ ہوگیا ہو! لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا، حالت بگڑتی چلی گئی ۲۶ ستمبر ۱۹۸۳ء کی شب میں کوئی ساڑھے گیارہ بجے بے چینی سی محسوس کی، سانس میں الجھن تھی، اور دل میں بھی ہلکے سے درد کی شکایت کی۔ فوری طور پر انھیں ہمادیر اسپتال میں لے گئے۔ اگرچہ علاج سے تکلیف میں کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا، لیکن ہوش و حواس بالکل ٹھیک تھے۔ آخر وقت تک بقدر ضرورت بات چیت کرتے رہے۔ اگلی صبح (سہ شنبہ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۳ء) چھ بجکر بیس منٹ پر وہیں اسپتال میں جاں بحق ہوگئے۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجِعُونَ

چونکہ بھانجے و مرشد مولانا سیّد خدا بخش خوندمیری مدظلہٗ بڑے لڑکے ڈاکٹر سید جاوید عالم اور بیٹی صہبا حیدر آباد سے باہر تھے، اس لئے جنازہ ان کے آنے کے بعد اگلے دن ۲۸ ستمبر ساڑھے دس بجے اٹھا؛ اور انھیں خاندانی ہڑواڑ یعنے حظیرۂ حضرت بندگیمیراں سیّد قاسم مجتہد گردہ جہرویہ مشیر آباد میں اپنے والد حضرت سید میراں خوندمیری کے مدفن کے پائیں سپرد خاک کیا گیا۔

جیسا کہ کہہ چکا ہوں، ان کی زندگی میں ان کی کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی۔ خوشی کا مقام ہے کہ اب ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی ہے، جو اُن کی نگارشات جمع کرکے شائع کریگی۔

یہ پہلی جلد اُن کے بھانجے مولانا سید خدا بخش خوندمیری مدظلہٗ نے مرتب کی ہے۔ ہم ان کے ممنونِ احسان ہیں۔ خدا کرے، یہ کام بحُسن و خوبی سرانجام ہو۔ آمین!

مالک رام

نئی دلّی
۲۷ ڈسمبر ۱۹۸۳ء

باسمہٖ تعالیٰ

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم

خاندانی پس منظر، خاکہ اور تاثر

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم بتاریخ ۹ جمادی الآخر ۱۳۴۰ھ، فروری ۱۹۲۲ء اس دنیائے آب و گل میں قدم رکھا۔ والد بزرگوار حضرت میاں سید میراں خوندمیری علیہ الرحمہ نے تاریخ پیدائش کہی

"سید عالم خوندمیری، اسم صالح اوشدہ"

۱۳۴۰ ہجری

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کا سلسلۂ نسب تیرھویں پشت پر خاتم محبت مہدی موعودؑ حامل بارامانت سید الشہداء حضرت بندگیمیاں سید خوندمیر صدیق ولایت رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو پہنچتا ہے اور حضرت بندگیمیاں خوندمیرؓ خود اپنی انیسویں پشت پر امام المتقین، وصی رب العالمین، امیر المومنین حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو پہونچتے ہیں۔ حضرت سیدنا علیؓ، آنحضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس طرح برادرِ عم زاد صحابیٔ خاص اور دامادِ رسولِ مقبولؐ ہیں بعینہٖ حضرت سیدنا خوندمیرؓ، آنحضرت خاتم ولایت مقیدہ محمدیہ میر سید محمد (جونپوری) مہدی موعود خلیفۃ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جدی رشتہ میں منسلک ہونے کے علاوہ آنحضرتؐ کے خلیفۂ خاص اور داماد بھی ہیں۔ اسی نسبی نسبت کے باعث حضرت بندگیمیاں سید خوندمیرؓ کی اولاد "خوندمیری" مشہور ہے۔ عالم صاحب مرحوم کے سلسلۂ نسب کی تفصیل یوں ہے، کہ:-

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری بن سید میراں خوندمیری بن سید عالم بن سید میراں بن سید حسین

بن سید خوندمیر بن سید علی بن سید میراں بن سید جلال بن سید میراں بن میاں سید محمود بن بندگی میاں سید علی ستون دینؓ بن بندگیمیاں سید محمود سید نجی خاتم المرشدینؓ بن سید الشہداء حضرت بندگیمیاں سید خوندمیر صدیق ولایتؓ بن سید موسیٰ شہید بن سید خوندمیر بن سید جلال بن سید خوند سعید بن سید عبداللہ بن سید عبدالقادر بن سید عیسیٰ بن سید احمد بن سید حمید بن سید نجم الدین بن سید نعمت اللہ بن سید اسمٰعیل بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام سید زین العابدین بن سید الشہداء امام سیدنا حسینؓ بن امام المتقین امیر المومنین سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ کے اجداد میں سب سے پہلے سید نعمت اللہؒ بغداد سے ہجرت کر کے مرو شاہجہاں میں سکونت اختیار کی۔ اور وہی سرزمین آپ کا مدفن بھی بنی۔ آپ کی اولاد کو ایک عرصہ بعد پھر ہجرت اختیار کرنی پڑی اور بخارا میں قیام پذیر ہوئی۔ پھر ان کی نسل میں سے بعض لوگوں نے ہجرت کرتے ہوئے، جن میں صدیق ولایتؓ کے جدِ اعلیٰ بھی شامل تھے، ہندوستان کا رخ کیا۔ اور آگرہ سے قریب شہر باری (بیانہ) میں مقیم ہوئے۔ سب سے آخر میں سید خوندمیر بن سید جلال نے باری (بیانہ) سے ہجرت کر کے شہر پیران پٹن نہر والہ گجرات میں سکونت اختیار کی۔

حضرت بندگی میاں صدیق ولایتؓ، اوائل عمر ہی سے تلاش حق میں سرگرداں رہے بالآخر آنحضرت میراں سید محمد (جونپوری) مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری پر حصول مقصد میں کامیاب ہوئے اور حضورؑ کی مہدیت کی تصدیق کے بعد خلیفۂ خاص اور بدلِ ذاتِ مہدی موعودؑ شمار کیے جانے کے علاوہ داماد ہونے کے شرف سے مفتخر ہوئے۔ گجرات سے خراسان تک حضرت امامناؑ کے ساتھ شریکِ ہجرت رہے۔ آپؑ کے وصال کے بعد عرض ہی وہم سے فارغ ہو کر خراسان سے گجرات تشریف لائے۔ حضرت مہدی موعودؑ کا وصال مبارک ۱۹ ذی قعدہ ۹۱۰ھ میں ہوا۔ اس کے بعد بیس سال آپ باحیات رہے، مسلسل ہجرت اور بدخواہوں کی ایذا رسانی سے دوچار رہے۔ آخر کار حسبِ رضائے الٰہی اور

بموجب بشارت امامنا مہدی موعودؑ، معرکہ بدر ولایت پیش آیا۔ ۱۲ شوال ۹۳۰ھ چہارشنبہ، اس معرکہ میں پہلے دن کی جنگ میں بمقام کھانبیل (گجرات)، شاہ مظفر والی گجرات کی فوج بروایتے سترہ ہزار و بروایتے انتیس ہزار کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح و نصرت عطا کی تیسرے دن یعنے ۱۴ شوال ۹۳۰ھ جمعہ کی جنگ میں بمقام سدراسن (گجرات) آپ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اور تین جگہ تدفین ہوئی جسد مبارک کا سدراسن، استخوان سر مبارک کا پٹن اور پوست سر مبارک کا چاپانیر (پایہ تخت گجرات) مدفون ہوا۔

حضرت صدیق ولایت کے صاحبزادے حضرت بندگی میاں سید محمود سیدنجی خاتم المرشدین ۹۲۴ھ میں بمقام جالور پیدا ہوئے والد بزرگوار کے ساتھ ہجرت و جنگ میں شریک رہے اور ایک عرصہ بعد گجرات سے ہجرت کر کے جالور (راجستھان) میں دائرہ قائم کر کے سکونت پذیر ہوئے۔ ۹۸۰ھ میں شہنشاہ جلال الدین اکبر علمائے دربار کی ایماء پر بمقام احمد آباد، اپنے دربار میں آپ کو طلب کیا۔ علمائے دربار کی جانب سے ملا عبدالنبی نے بحث کی۔ بحث ثبوت مہدیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمائے دربار کے مقابلہ میں سرخروئی و کامیابی عطا کی جس پر شہنشاہ اکبر کو اپنے علمائے دربار سے کہنا پڑا۔ "تم، ان کو مہدی کا نواسہ کہتے ہو۔ اگر یہ خود بھی مہدیت کا دعویٰ کرتے تو حق بجانب ہوتے۔" پھر نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ آپ کو رخصت کیا۔ مختصر یہ کہ بتاریخ ۱۵ محرم ۹۹۶ھ چہارشنبہ بوقت (۲) ساعت دن، بمقام جالور آپ کا وصال ہوا۔ وہیں مدفن ہے۔ حضرتؓ کے وصال کے بعد آپ کے ایک فرزند حضرت بندگی میاں سید علی ستون دین رض جالور سے ہجرت کر کے بالآخر دکن آئے جبکہ آپ کی ولادت ۹۶۳ھ بمقام کھانبیل ہوئی تھی، آپ کا وصال ۱۴ رجب ۱۰۲۶ھ بمقام مدک پلی (ضلع نظام آباد ریاست آندھرا پردیش) ہوا اور وہیں مدفون بھی ہیں۔ حضرت علیہ الرحمہ کے فرزندوں میں سے ایک حضرت میاں سید محمودؒ جن کا وصال ۲۳ صفر ۱۰۴۱ھ میں ہوا وہ بھی مدک پلی ہی میں دفن ہوئے جبکہ آپ کے فرزند حضرت میاں سید میرانؒ، دکن سے نکلکر کچھ مدت تک بیجاپور میں مقیم رہے۔ پھر وہاں سے ہجرت کر کے نیوانہ، جے پور (راجستھان) میں سکونت اختیار کی۔ ۳ محرم ۱۰۸۸ھ کو وصال ہوا۔ دائرہ تیگریہ مدفن ہے۔ ان کے ایک فرزند میاں سید جلال، ہاتھیوں کے تاجر تھے ۱۵ ذی حجہ ۱۱۱۳ھ کو انتقال کئے اور ان کا مدفن بھی دائرہ تیگریہ ہی ہے حضرت میاں سید میراں (مورث اعلیٰ)

؎ ۔ حضرت میاں سید خدا بخش میاں جی صاحب بن میاں سید جلال کی اولاد میں ہم اہلیان بنیا دائرہ ہیں۔

اہلیان خاندان ہتھیڑہ) نیوانہ سے ہجرت کر کے اپنے ننھیال ہتھیڑہ جے پور (راجستھان) میں مقیم ہوئے
ان کا مدفن بھی یہیں ہے۔ ۳۰ ربیع الاول ۱۱۶۳ھ دوشنبہ آپ کا یوم وصال ہے۔ آپ کے فرزند میاں سید علی کا
انتقال ۱۰ ذی قعدہ اندرون ۱۲۰۰ھ ہتھیڑہ ہی میں ہوا۔ مدفن بھی وہیں ہے۔ آپ کی اولاد میں سے
ایک فرزند میاں سید خوندمیر ہتھیڑہ جے پور سے ہجرت کر کے چنچل گوڑہ سابق ریاست حیدرآباد (موجودہ
آندھراپردیش) آئے آپ بتاریخ ۹ محرم ۱۲۳۰ھ انتقال کئے۔ ان کا مدفن بورکھیڑہ (چالیس گاؤں مہاراشٹرا)
ہے چنچلگوڑہ میں موجودہ مسجد و دائرہ (ہتھیڑہ) کے بانی میاں سید خوندمیر ہی ہیں۔ آپ کے فرزند میاں سید حسین
(عالم علوم متداولہ و حکیم حاذق) چنچل گوڑہ سے ہجرت کر کے واپس ہتھیڑہ جے پور چلے گئے۔ دوران حیات
ایک بار حیدرآباد آپ اپنے مرشد میاں سید ابراہیم (دائرہ نو) کی صحبت میں رہنے کی غرض سے چنچل گوڑہ
تشریف لائے تھے۔ میاں سید علی یداللہی (والد محترم علامہ شمسی) علوم متداولہ میں موصوف کے شاگرد تھے مرشد
کے وصال ۱۲۳۵ھ کے بعد ہتھیڑہ واپس لوٹ گئے۔ وہیں ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۶۵ھ رحلت کی۔ وہیں آپ کا
مدفن ہے۔ میاں سید میراں ابن میاں سید حسین ہتھیڑہ جے پور سے قطبی گوڑہ (حیدرآباد) آ کر مقیم ہوئے
اور ۲ رمضان ۱۲۹۲ھ میں انتقال کر کے حظیرہ حضرت بندگی میراں سید قاسم مجتہد گروہ مشیرآباد (حیدرآباد) میں دفن ہوئے۔
ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کے حقیقی دادا، الحاج مولانا سید عالم صاحب کی ولادت
ہتھیڑہ جے پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا میاں سید حسینؒ سے حاصل کی اور مرید بھی انہی کے تھے۔
صحبت و سند ارشاد میاں سید عزیز میراں صاحب بن میاں سید علی سے حاصل کی تھی۔ اٹھارہ سال کی
عمر میں ہتھیڑہ جے پور سے آ کر اپنے والد میاں سید میراں کے پاس قطبی گوڑہ میں قیام کیا۔ دارالعلوم حیدرآباد
سے فارغ التحصیل ہو کر اسی مدرسہ میں بحیثیت معلم و مدرس ملازمت اختیار کی۔ شہر حیدرآباد کے اکثر امراء و رؤساء
اور عہدہ داران عظام آپ کے شاگرد رہے ہیں جن میں قابل ذکر نواب شہاب جنگ، نواب مکرم الدولہ بہادر،
نواب شبیر نواز جنگ صوبہ دار، مولوی غلام رسول صاحب معتمد مالگزاری، عبدالقادر صاحب صوبہ دار،
سر قمرالدین جسٹس وغیرہ وغیرہ افراد قومی میں سے میاں سید محمود یداللہی نبیرہ میاں سید اشرف عالم اچھا میاں صاحب
یداللہی، حافظ میاں سید محمود صاحب (کالاڈیرہ) سید شریف صاحب یداللہی، مولوی سید علی صاحب

مددگار صدر محاسبی، مراد میاں صاحب (دائرہ کلاں)، سید محمد منور صاحب وکیل درجہ اول، محمد منور خاں صاحب صدر محاسب، اور محمد عظمت خاں صاحب جمعدار وغیرہ کو آپ سے تلمذ حاصل رہا ہے ۱۹ر شعبان ۱۳۱۳ھ میں انتقال ہوا۔ حظیرۂ مشیر آباد میں مدفون ہیں۔

ڈاکٹر عالم صاحب مرحوم کے والدِ محترم میاں سید میراں خوندمیری کمسنی ہی میں اپنی والدہ محترمہ کی کنارِ شفقت سے محروم ہو کر اپنے والد مکرم کے ناز و نعم سے پرورش پائے۔ گیارہ سال کی عمر تک والد کی زیرِ نگرانی خانگی طور پر تعلیم پاتے رہے۔ بعد ازآں مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد میں شریک ہوئے۔ بحرالعلوم مولانا سید اشرف صاحب شمسی یداللّٰہی سے عربی اور مولوی سید محمود صاحب یداللّٰہی سے فارسی میں تلمذ حاصل رہا۔ نظامت تعلیمات میں مامور و ملازم ہوئے اور ناظرِ تعلیمات کے عہدہ پر پہنچکر وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ اولاً میانسید اشرف خزادے میانصاحب (دائرہ نو) سے مرید ہوئے۔ بعد تجدید علاقہ حضرت میانسید اسمٰعیل موسیٰ میانصاحب (ہستیڑہ) کے ہاتھ پر ترکِ دنیا کے فرض کی ادائیگی کرتے ہوئے وظیفۂ حسنِ خدمت سے بھی سبکدوشی اختیار کرلی۔ ملت اسلامیۂ ہند کے مشہور قائد، قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی کوشش سے آپ کو مرحوم قرار دیکر آپ کی منکوحہ سوم رابعہ بانو بنت راج محمد صاحب اوسوی (لاولد) کو وظیفۂ بیوگی اجرا کرنے سے متعلق فرمانِ نظام سابع جاری ہوا۔ حضرت قبلہ کو حضرت حکیم سید اشرف خزادے میاں صاحب (صاحبِ دائرہ ہستیڑہ۔ جے پور) سے علاقۂ صحبت و سندِ ارشاد حاصل تھی۔ بتاریخ ۱۴ر صفر ۱۳۶۵ھ میں انتقال ہوا۔ حظیرۂ مشیر آباد میں دفن ہیں۔

اس ساری تفصیل سے مقصود یہ واضح کرنا تھا کہ ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کے اجداد نہ صرف صحبتی و سندی بزرگ رہے ہیں بلکہ ان میں رشد و ہدایت کا سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا ہے۔ یہی اساطیری اساس اور بنیادی سبب تھا جس کی وجہ سے عالم صاحب کو "صوفی ازم" اور "صوفیانہ تحریکوں" سے خاص شغف تھا۔ اس لئے کہ تصوف سے دلچسپی اور لگاؤ بطور ورثہ ان کے حصہ میں آیا تھا۔

میاں سید میراں خوندمیری کی پہلی شادی، ان کے اپنے برادرِ عم زاد سید نور محمد صاحب ابن سید میراں صاحب بن غازی سید نجم الدین صاحب کی صاحبزادی خزادی بی سے بتاریخ ۶ر ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ

بمقام رسول پورہ (جے پور، راجستھان) ہوئی۔ اس بی بی کے بطن سے ایک لڑکی زلیخا بانو ہوئیں جو کمسنی میں فوت ہوگئیں اور زوجۂ اول خزادی بی بی بھی بتاریخ ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ حضرت موصوف کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ اس سانحہ کے بعد یعنے ۲۷ شعبان ۱۳۳۰ھ کو بحر العلوم علامۃ العصر اشرف العلماء مولٰنا سید اشرف صاحب شمسی ید اللّٰہی صاحب تفسیر لوامع البیان کی دختر نیک اختر سیدہ شمس النساء عرف ماں صاحبہ بی بی سے عقد کیا۔ یہ زوجہ بھی اٹھارہ سال تک موصوف کی شریکِ حیات رہنے کے بعد بعارضۂ تپ دق بتاریخ ۷ جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ بروز چہارشنبہ (۷) ساعت صبح اس دنیا سے رخت سفر باندھا، خطیرہ چنچلگوڑہ میں مدفون ہوئیں۔ اپنے پیچھے باقیات الصالحات کے طور پر چار لڑکیاں اور ایک لڑکا حسب تفصیل ذیل چھوڑ گئیں۔ (۱) امۃ اللہ ماں نجانی بی بی مرحومہ زوجہ سید اسحاق ابن سید عبد اللہ ابن پیر و مرشد میاں سید محمد حسین شاہ میاں صاحبؒ (دائرہ نو) (۲) امۃ المہدی بھیاں بی بی۔ والدہ محترمہ فقیر راقم الحروف (دائرہ نو) (۳) ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم (۴) امۃ العزیز صاحب خاں بی بی زوجہ سید محمد تقی ابن سید قاسم ابن پیر و مرشد سید محمدؒ (دائرہ نو) (۵) امۃ المحمد آغا ماں صاحبہ بی بی زبیدہ زوجہ سید ابراہیم بن خزاد میاں صاحب۔

تسمیہ خوانی کے دوسرے دن یعنے ۱۴ شوال ۱۳۴۴ھ م ۱۹۲۵ء کو علامہ شمسی صاحب مرحوم نے اپنے چہیتے نواسے کو بنفس نفیس پہلا سبق دیکر مکتب میں بٹھایا۔ فارسی کی تعلیم تو خود دیتے رہے اور اپنی خاص نگرانی میں خانگی طور پر ایک استاد کے ذریعہ اردو، انگریزی اور ریاضی وغیرہ علوم مروجہ کی تعلیم دلواتے رہے۔ عربی کی ابتدائی تعلیم الحاج ابو العائذ سید احمد منوری صاحبؒ سے حاصل کی۔ علامہ شمسی صاحب نے ۱۳۴۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور عالم صاحب کو مدرسہ وسطانیہ میں شریک کر دیا گیا۔ جہاں سے ۱۹۳۷ء میں امتحان میٹرک بدرجۂ دوم کامیاب ہو کر نکلے۔ ۱۹۳۹ء میں مضامین منطق و نفسیات اور اختیاری زبان عربی سے امتحان انٹرمیڈیٹ بدرجہ دوم کامیاب کیا۔ ۱۹۴۱ء میں فلسفہ مضمون لیکر بدرجۂ دوم بی اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اور اسی مضمون میں بدرجہ دوم ہی ۱۹۴۳ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس عرصہ میں حضرت علامہ الحاج مولٰنا سید شہاب الدین صاحبؒ سے علم حدیث و فقہ کی تحصیل کی۔ ایم اے

کرنے کے بعد یل یل بی میں داخلہ لیا، لیکن تعلیم جاری نہ رہ سکی۔

سلسلۂ تعلیم جاری ہی تھا کہ صنعتی مزدوروں کی تحریک میں عملاً حصہ لیکر سیاسی زندگی کا بھی آغاز کر دیا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں نظام اسٹیٹ ریلوے ایمپلائز یونین کے نائب صدر اور سنہ ۱۹۴۱ء میں آلوین میٹل ورکس یونین کے صدر کی حیثیت سے حیدرآباد ریاست میں ٹریڈ یونین تحریک کی بنیاد رکھی۔ اسی زمانے میں COMRADE ASSOSIATION کے نام سے ایک تنظیم کی طرح ڈالی۔ آندھرا مہاسبھا کا قیام عمل میں آیا تو اس کے بھی رکن رکین ہو گئے۔ ریاست حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی کی حیثیت سے سرگرم رہے۔ تلنگانہ تحریک میں بھی ایک فعال رکن کی حیثیت سے جان ڈالی۔ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا یہ دور سنہ ۱۹۴۵ء تا سنہ ۱۹۴۹ء پر محیط ہے۔ آزادئ ہند کے بعد پولس ایکشن کے نتیجہ میں ریاست حیدرآباد کو زوال آیا تو سنہ ۱۹۴۹ء میں کچھ مدت کیلئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہ کر آئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد سے بھی عرصۂ دراز تک وابستہ رہے۔ مولانا ابوالکلام اورینٹیل انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔ اقبال اکیڈمی کے قیام میں نمایاں رول ادا کیا اور اس کے نائب صدر منتخب ہوئے۔

ابتداء میں اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد اسٹیٹ بینک میں PROBATIONARY OFFICER کی حیثیت سے تقرر ہوا تھا لیکن طبع آزاد کو غلامی کی بندھن میں جکڑے رہنا گوارا نہ ہوا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء میں اس ملازمت کا طوق غلامی اتار آئے۔ کیوں کہ ان کی پسند کے مطابق اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرار تقرر ہو گیا تھا۔ اولاً اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء آرٹس کالج ورنگل میں درس و تدریس پر مامور ہوئے۔ کچھ عرصہ تک آرٹس اینڈ سائنس سٹی کالج اور پھر نظام کالج میں لکچراری کے فرائض انجام دیتے رہے سنہ ۱۹۶۲ء میں آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے جہاں پہلے ریڈر اور پھر بعد کو پروفیسر کی حیثیت سے تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتے رہے۔ سنہ ۱۹۸۲ء میں بحیثیت صدر شعبۂ فلسفہ، وظیفہ حسنِ خدمت حاصل کیا۔ دورانِ درس و تدریس ہی مولانا سید شاہ قطب الدین حسینی صابری امیر جامعہ نظامیہ سے علم تفسیر کی تحصیل کی اس کے ساتھ ساتھ علم فقہ کو بھی انہی سے تازہ کیا۔ نیز اسی دورانِ مدت میں عثمانیہ یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۶۸ء میں اپنے ہی مضمون فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا۔ مقالہ کا عنوان "تصورِ زماں مغربی اسلامی فلسفہ میں" تھا اور اس

مقالہ کی خصوصیت "جدید اسلام میں اقبال کا مقام" تھی۔

بتاریخ ۲۹ رجب ۱۳۶۱ھ م ۱۳ اگست ۱۹۴۲ء پنجشنبہ کو اپنی ہی عم زاد سیدہ خدیجہ بانو (فیضی) بنت مولوی ابوالحسن سید علی صاحب ایڈوکیٹ (صدر مجلس اتحاد المسلمین و صدر مرکزی انجمن مہدویہ) سے رشتہ ازدواج قائم کیا۔ ساری زندگی اس رشتہ سے مطمئن و مسرور رہے۔ خدیجہ عالم خوندمیری کے بطن سے (۴) لڑکے اور (۲) لڑکیاں ہوئیں) جن کی تفصیل یوں ہے۔ ڈاکٹر سید جاوید عالم خوندمیری، سید عزیز محمد اجمل عالم خوندمیری آرکیٹکٹ، سید محمود فرخ سیر عالم خوندمیری (ایم۔اے) سیدہ شمس النساء صبوحی (ایم۔اے) سیدہ مہر النساء صہبا (ایم۔اے) سید میراں ارسلان مہدی (ایم۔اے)۔

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کے مطالعۂ فکر کا خاص میدان ادب اور فلسفہ (تاریخ مذاہب) رہا ہے۔ تمام مذاہب عالم کا نہایت تحقیق و جستجو سے مطالعہ کیا اور مذاہب کی اصل روح کو مختلف ادوار کی جمنے والی دبیز تہوں سے باہر نکال لائے۔ اسلام اور بالخصوص مسلک صوفیا، کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ جیسا کہ قبل ازیں، فقیر نے لکھا ہے کہ وہ خود بھی ولایت کے اسرار اور تصوف کا پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے تصوف سے ان کے شغف کا غیر معمولی ہونا کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور یہ طرز فکر ان کا اساطیری اساس تھا۔

ڈاکٹر عالم مرحوم کے انگریزی اور اردو مضامین و مقالہ جات کا شمار کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ان مضامین کا احاطہ اقطاع عالم تک وسیع رہا ہے ہمہ گیر شہرت اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں اور درسگاہوں میں مدعو کئے جاتے رہنے کی وجہ سے ہر مسئلہ اور ہر مسلک پر بے لاگ بے تکان لکھا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ سطحی اور روایتی طرز تفکر سے ہٹ کر گہرے غور و فکر کے نتائج کی روشنی میں قلم اٹھایا ہے، دوسری ان کی عظیم خوبی یہ تھی کہ اپنی فکر و رائے پر تنقید اور بحث سے جھنجلائے نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ خود ہی تنقید و بحث کیلئے ارباب علم و دانش کو دعوت دی ہے۔ چنانچہ ماہنامہ نور حیات جولائی ۱۹۷۱ء کا مضمون "ایک بات" اس امر کا شاہد عدل ہے۔

نسبتی

اپنے سگے عالم جلیل نانا کی درویشانہ زندگی، والد بزرگوار کی زندگی کے نشیب و فراز اور برادر

یعنے راقم الحروف کے والد محترم کی فقیرانہ روش نے ڈاکٹر عالم خوندمیری مرحوم کے قلب و ذہن میں دنیا اور متاعِ دنیا کی محبت کو جمنے ہی نہ دیا۔ اس کا ثبوت یہہ کہ اس دنیا میں اپنے رہنے کے لئے وہ ایک گھر تک بنوانے پر مائل نہوئے۔ دنیا میں رہے لیکن دنیا سے کنارہ کش اور حُبِّ دنیا سے دور بہت دور عشقِ الٰہی کی آگ میں خود بھی جلے اور دوسروں کو بھی جلنے کی تلقین کرتے رہے۔

صاحبِ ارشاد فقیر کی "صحبت و نظر" عالم صاحب مرحوم کے نزدیک بہت بڑی چیز تھی۔ اس کا تجربہ اور مشاہدہ خود راقم الحروف کی ادائیگی فرض ترک دنیا کے موقع پر ہوا تھا۔ ۳ نومبر ۱۹۶۳ء یکشنبہ دن کے (۱۰) بجے فقیر اپنے مشفق و مہربان ماموں عالم صاحب مرحوم کے مکان ہی تھا۔ ان دنوں میری ملازمت، ورنگل میں تھی۔ فقیر کے پدر محترم، پیر مکرم حضرت قبلہ گاہ علیل تھے۔ چاہتے تھے کہ ان کا کوئی ایک لڑکا منصب رشد و ہدایت کو سنبھال لے۔ حضرت قبلہ گاہ کے محبانِ مخلص میں سے تین اصحاب مکرمی سید مبارک صاحب (کالاڈیرہ) فقیر کے پھوپی زاد بھائی سید زین العابدین صاحب (دائرہ نو) اور جناب یار علی خاں صاحب مرحوم دولت زئی، عالم صاحب مرحوم کے پاس پہنچے۔ ان اصحاب کو معلوم نہ تھا کہ اتفاق سے فقیر بھی وہیں موجود ہے۔ ان اصحاب کی آمد کا مقصد یہہ تھا کہ عالم صاحب مجھ فقیر کو ترغیب دلائیں کہ میں ترک دنیا کے فرض کی ادائیگی کرلوں۔ اتنے میں عالم صاحب باہر سے مکان میں آئے اور فوراً مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "مرشد بھائی کی حیات ہی ترک دنیا کرلے تاکہ ان کی صحبت اور نظر تجھے میسر آجائے اگر تو، اس وقت اس تعلق سے تیار نہیں ہے تو پھر ان کی وفات کے بعد بھی نہ کرنا"۔ فقیر نے کہا "ہماری قومی و خاندانی روایات اس طرح کے عمل سے تواتراً چلی آرہی ہیں۔ اس میں میرے لئے ہچکچاہٹ کیا ہے۔ دوسرے یہہ کہ خاندانی مرشدوں کے ملفوظات اور بیاضات بھی موجود ہیں جس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے"۔ عالم صاحب نے پلٹ کر پھر کہا۔ "دیکھو میاں! قدیم میں باہمی خلوص و محبت اور یگانگت بدرجہ اتم موجود تھی اور مقصود، ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ اُس وقت کسی فقیر کو دوسرے مرشدین اپنے فیض صحبت و نظر سے مالا مال کردیا کرتے تھے لیکن اب وہ بات نہیں رہی ہے۔ اس طرح کا ترک دنیا کرنا مقصود، سے بہت دور کردیگا۔ اب رہی بات ملفوظ و بیاض کی۔ اگر رموز و اسرار کو خود سے سمجھنے کیلئے یہہ کافی ہوجاتی ہوں۔

تو پھر بیانِ قرآن کے نزول کیلئے اور فہم قرآن کیلئے امام مہدی موعودؑ کی بھی ضرورت نہ ہوتی"۔ ان کی اس مختصر سی گفتگو نے فقیر کے ذہن کے سارے دریچے کھول دیئے اور جس ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانے میں چھ ماہ کے زائد عرصہ سے فقیر پس و پیش کر رہا تھا۔ آنِ واحد میں اس کے لئے بخوشی تیار ہو گیا۔ مختصراً یہ کہ اسی دن قبل از نمازِ عصر فقیر کو ترک دنیا کے تکمیلِ فرض کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کا اجر عالم صاحب کی روح کو عنایت فرمائے۔ فقیر کے والد نے ان کلماتِ خیر کے صلہ میں اپنے برادر نسبتی عالم صاحب کے حق میں "دعائے ایمان" فرمائی۔ ایک صاحبِ فکر اور ایک عام آدمی کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اس کو سمجھنے کے لئے یہی ایک واقعہ کافی ہے۔

ایثار یہ نہیں کہ جس چیز کی ہمیں ضرورت نہ ہو وہ دوسرے کو دیدی جائے۔ عالم صاحب مرحوم میں جذبۂ ایثار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک دفعہ کی بات ہے جبکہ فقیر کی عمر ۱۸، ۱۹ سال کی تھی، موصوف کے ساتھ نمائش دیکھنے گیا تھا۔ اسی دن ان کی ماہانہ تنخواہ ملی تھی۔ اور وہ نیا سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ واپسی میں ہم دونوں نے سیکل رکشا کی سواری کر لی۔ رکشاران ادھیڑ عمر کا ایک لاغر محنت کش تھا۔ اور جو کچھ اس کے جسم پر لباس تھا، وہ سردی سے بچاؤ کیلئے بالکل ناکافی تھا۔ مکان پہونچنے کے بعد جسم سے اپنا کوٹ اتار کر رکشاراں کو للہ دیدیا۔ وہ غریب ششدر و حیران کہ یہ کیا معاملہ ہے لیکن انہوں نے ازراہ شفقت اسے ڈرا کر کوٹ لینے پر مجبور کر دیا۔ رات، میں انہی کے مکان میں سو گیا تھا۔ صبح برانڈے میں، ہم دونوں چائے پیتے بیٹھے تھے کہ وہی رکشاراں پھر آیا۔ اور پرس دیتے ہوئے کہا کہ "کوٹ کی جیب میں یہ پرس رہ گئی تھی"۔ عالم صاحب بولے "جامیاں! یہ بھی تیرے نصیب کے تھے۔ میں نے تو سب کچھ تجھے للہ دیدیا ہے۔ جا، بھاگ جا میری بیوی آئیگی تو مجھے بھی اور تجھے بھی دونوں کو مار بیٹھے گی"۔ نہایت اصرار کے ساتھ اس کو پرس سمیت واپس کر دیا۔ ایسے ہی ایک دفعہ نہایت قیمتی ٹویڈ کی شیروانی، بہشتی کو دیدی کہ سردی سے وہ اپنا بچاؤ کر سکے۔

ایک وقت کا واقعہ ہے کہ ہم دونوں شام کے وقت چائے پیتے بیٹھے تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور عالم صاحب سے خواہش کی کہ وہ ان کے ضامن بن جائیں۔ عالم صاحب کچھ پوچھے بغیر

کاغذات پر دستخط کر دیئے اور مجھ سے کہا کہ اسٹامپ لگا دوں۔ موصوف کے چلے جانے کے بعد میں نے عالم صاحب سے پوچھا کہ وہ صاحب کون تھے۔ کہنے لگے کہ میں نہیں جانتا۔ پھر آپ نے دستخط کیوں کر دیا عجیب بات کہی کہ "میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ مجھے جانتے ہیں"۔ ایک عرصہ بعد تحلقہ بینک سے نوٹس آئی۔ صرف تیس ہزار کا قرض اپنی تنخواہ سے ادا کر دیا۔ اس قسم کے بے شمار واقعات سے عالم صاحب کی زندگی بھری پڑی ہے۔ یہی وہ سبب ہے کہ آرام و آسائش میسر ہونے کے باوجود عالم صاحب نے کبھی بھی آرام و آسائش کو اپنا مقصودِ حیات نہیں بنایا۔

لگے ہاتھوں ترک لذت کا بھی ایک واقعہ سن لیجئے۔ ایک دفعہ کی بات ہے عالم صاحب یونیورسٹی سے ۳ بجے کے بعد واپس مکان آئے۔ بہو نے کھانا دیدیا۔ موصوف کھا کر سو گئے اور کچھ دیر بعد جب موصوف کی بیوی اور بہو کھانے لگیں تو پہلا نوالہ ہی بین میں تھوک دیا۔ ترائی کا سالن تھا۔ اور سارے کا سارا کڑوا نیم۔ جب عالم صاحب بیدار ہوئے تو دریافت حال کیا گیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں بی بی۔ مجھے تو معلوم ہی نہ ہو سکا۔"

ایک دفعہ عالم صاحب اپنے خسر محترم کے اصرار پر نظام سابع سے ملنے گئے یہ بات پولس ایکشن سے پہلے کی ہے۔ جب سامنا ہوا۔ السلام علیکم، کہکر ملاقات کی۔ نظام سابع نے انھیں اوپر سے نیچے تک دیکھکر پوچھا۔ "ارے۔ یہ تو مزدوروں کا ہمدرد کب سے ہو گیا۔" عالم صاحب نے کہا "جب سے میں نے پڑھا کہ رسول عربی نے مزدور کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اس کے پسینے کے سوکھ جانے سے قبل مزدوری دینے کی تاکید کی ہے۔" مولوی ابوالحسن سید علی صاحب پشیمان ہو گئے۔ لیکن مردم شناس نظام سابع نے کہا۔ "ارے ابوالحسن! مجھے یقین آ گیا کہ تیرا داماد، مولوی شمسی کا نواسہ ہے۔" اور فوراً رخصت کی اجازت دیدی۔

ایمرجنسی کے دور میں ۲۱ دسمبر ۱۹۷۵ء کو PUBLIC INTEREST کے عنوان سے ملازمت سے نکال دیئے گئے۔ پیشانی پر شکن آئی اور نہ جسم میں جنبش ہوئی۔ احباب نے مشورہ دیا کہ وزیر اعظم سے ربط پیدا کیا جائے۔ لیکن عالم صاحب نے گوارا نہیں کیا۔ A.P. HIGH COURT سے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء کو مقدمہ جیت کر ملازمت پر بحال ہوئے۔ یہ بھی ایک رخ ہے عالم صاحب کی زندگی کا

اوروں کی طرح جھک جاتے۔ دنیا کی دولت اور اعزاز سے مالا مال ہوجاتے۔ عہدہ اور دولت کی خاطر عظمت انسانی کو داغدار کرنا، عالم صاحب کی فطرت میں نہیں تھا۔

شری برہمانند ریڈی، سابق چیف منسٹر حکومت آندھرا پردیش نے حیدرآباد کی پارلیمنٹری سیٹ کیلئے عالم صاحب کا نام تجویز کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ مجلس اتحاد المسلمین کا تعاون حاصل کریں۔ عالم صاحب ہر سطح کی فرقہ واریت سے بالاتر تھے۔ انہوں نے معذرت کرتے ہوئے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۲۸ ڈسمبر ۱۹۸۲ء امریکہ گئے تھے۔ — PORT OF SPAIN, TRINIDAD میں NEW ERA CONFERENCE ہوئی تھی جس میں بعنوان "(God : THE CONTEMPORARY DEBATE, ISLAMIC PERSPECTIVE. اپنی زندگی کا آخری مقالہ پڑھا۔ اپنی فکر پہنچائی۔ اور ۲۷ اپریل ۱۹۸۳ء واپس آئے تو خاص بیماری ساتھ لائے۔ واپسی کے لئے شدید اصرار یہ کہہ کر کیا کہ "میرا مرشد حیدرآباد میں رہتا ہے جس سے "آخری بات" پوچھنی بھی ہے اور کرنی بھی"۔ اس مرض میں بھی غور و فکر کے کام برابر انجام دیتے رہے نہ مطالعہ میں کمی آئی، نہ پیاسوں کی پیاس بجھانے سے پیچھے ہٹے۔ اہل خلوص نے دل کھول کر اپنی محبت نچھاور کی۔ انہی ایام میں ایک مضمون بعنوان "ولایت و نبوت" عالم اسلام کی ایک دیرینہ بحث" پندرہ روزہ "نور ولایت" کے خاص شمارے کیلئے لکھوایا۔ جو ان کا آخری مضمون ہونے کا شرف حاصل کیا۔

"کسی" کے ایک عرصہ پہلے کے "خواب" کو یاد دلایا گیا، جس نے ایسا تڑپا دیا کہ چشتی گوڑہ سے سلیم نگر منتقل ہو کر اتنے مطمئن ہو گئے کہ "آخری فکر" سے بھی بے نیاز ہو گئے۔

۲۶ رمضان ۱۳۸۶ھ بعد ادائی نماز دوگانہ شب قدر فرض کے، فقیر راقم الحروف سے علاقہ بیعت استوار کیا، جبکہ اوائل عمری میں حضرت میاں سید اسمٰعیل موسیٰ میاں صاحب رح (اہل ہٹیرہ) سے مرید ہوئے تھے۔ الغرض بتاریخ ۱۹ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ م ۲۷ ستمبر ۱۹۸۳ء سہ شنبہ ۶½ ساعت صبح اس دنیائے فانی کو سلام کیا اور "منزل" پالی دوسرے دن یعنے ۲۰ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ م ۲۸ ستمبر چہار شنبہ ۱۰½ بجے دن خطیرہ

مشیر آباد میں اپنے والد بزرگوار کے پائیں آسودہ کئے گئے۔

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کے ایک مداح جناب مظفر الدین صاحب حیدرآبادی نے قطعہ تاریخ وفات کہی۔

عالم دین، مرد دانا فیلسوف　　کز شراب زندگی مخمور بود

کرد رحلت گفت صاحب سال مرگ　　سید عالم خوندمیری نور بود

۱۴۰۳

مختصر یہ کہ عالم صاحب مرحوم، فرد نایاب تھے۔ اسی لئے ماضی کی طرف دیکھکر، صبر کی دعا مانگنے کے سوائے کوئی اور چارہ نہیں۔ اگر عالم صاحب مرحوم کو ایک انجمن، ایک ادارہ کہا جائے تو زیادتی ہرگز نہیں کہلائیگی۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے

بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

اہل ہمت کی اس کمی نے آج ہمیں اس مقام پر پہونچا دیا ہے کہ بظاہر ہم تو مطمئن ہیں لیکن دل یہ کہتا ہے کہ یہ دردمندوں کی منزل نہیں۔ یہ عاشقوں کا مقام نہیں۔ تعلیم عام ہو رہی ہے، خوشحالی بھی کم نہیں لیکن دل سوز سے خالی اور ذہن بصیرت سے بڑی حد تک محروم۔ شہر میں "فقیہوں" کی بھی کمی نہیں، جو "خرد بین" سے کلمات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں اور لغت کی مدد سے احکام بھی صادر کر سکتے ہیں۔ لیکن "لغت" سے دماغ روشن نہیں ہوتے۔ یہ سچ ہے کہ عالم صاحب مرحوم فقیہان شہر کی طرح لغت ہائے مجازی کے قارون نہیں تھے۔ لیکن بلا خوف و خطر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ "قلندری" کے اسرار شناس تھے اور اسی لئے میں ان کی موت پر الم محسوس کرتا ہوں۔ مختصراً یہ کہ عالم صاحب کی موت ایک "شخص" کی موت تھی۔ میری التجا ہے کہ "شخص" کے معنے لغت میں تلاش نہ کیجئے۔ آیئے صبر کریں۔

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

کمترین عاصی حقیر فقیر سید خدا بخش خوندمیری میانجی عفی عنہٗ (دائرہ نو)

خلف و جانشین

عارف باللہ، متوکل علی اللہ پیر و مرشد حضرت میاں سید شریف خوندمیری اشرف میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ

۱۸ دسمبر ۱۹۸۳ء۔ یکشنبہ

ذاتِ رسالتمآب سے ربط کا تاریخی مفہوم

اس موقع پر جب پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت مناتے ہیں تو دراصل ہم اس عظیم شخصیت سے اپنی نسبت اور اپنے تعلق کو استوار کرتے ہیں۔ یہ اس امر کا اعلان بھی ہے کہ ہماری اجتماعی اور شخصی انفرادیت اسی ربط اور تعلق پر منحصر بھی ہے اور اسی سے عبارت بھی۔ یہ ربط ہمیں تاریخ سے مربوط بھی کرتا ہے اور مستقبل کے لئے نشانِ راہ بھی بنتا ہے۔ جہاں یہ ربط ہمیں تاریخ سے مربوط کرتا ہے وہیں اس امر کی بھی یاد دلاتا ہے کہ تاریخ کا یہ لمحہ جہاں پیغمبر اسلام نے ظہور فرمایا تھا عظیم تبدیلیوں کا لمحہ تھا۔ اس طرح ہم ماضی کے اس نقطہ سے اپنے آپ کو مربوط کرتے ہیں جہاں انسانیت نے ایک بڑے انقلاب کی گواہی دی تھی اس طرح ہم تاریخ کے شاہد بھی بن جاتے ہیں۔ تاریخ کے اس عظیم لمحہ کے شاہد بننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک بڑی ذمہ داری یا امانت کو اپنے سر لیتے ہیں اور اس کے حامل بن جاتے ہیں۔ شاہد بننے کا اگر صرف یہ مطلب ہوتا کہ ہم مسلسل اس لمحہ کو یاد کرتے رہیں اور ہر دور میں اپنے ہمعصروں کو جو کسی وجہ سے شاہد نہ بن سکے اس لمحہ کو یاد دلاتے رہیں تو اس کام کیلئے خود تاریخ یعنے اس کے صفحات کافی ہوتے ہیں۔ ایک زندہ انسانی گروہ کے لئے یہ ضروری نہ ہوتا کہ وہ شہادت کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے اور اگر ہر دور میں انسانی گروہ شہادت کے اس مفہوم پر قائم رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گروہ نے حرکت پذیر انسانیت سے اپنے آزاد ارادے سے اپنا ربط اور تعلق توڑ لیا ہے۔ اس منزل پر اس اہم حقیقت کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ جب افراد یا گروہ موجود سے اپنا ربط توڑ لیتے ہیں یا ربط قائم رکھنے میں ناکام رہتے ہیں تو وہ موجود کیلئے اپنی معنویت اور اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ وہ عجائب گھر کے لئے تو موزوں رہتے ہیں لیکن تاریخ کے لئے اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تاریخ عجائب گھر کے مترادف تو نہیں ہے، انسانی گروہ کی "اجل" کا یہ بھی ایک مفہوم ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایک انسانی گروہ اپنے لئے عجائب گھر میں ایک گوشہ ڈھونڈ لیتا ہے اور اسی پر قناعت کرتا ہے تو اجل کا قانون اس گروہ سے کوئی استثنائی سلوک تو روا نہیں رکھتا۔

جہاں تک اس ربط کا جو ہمیں پیغمبر اسلامؐ سے ہے خالص روحانی پہلو کا تعلق ہے وہ ہر لمحہ اس امر کو یاد دلاتا ہے کہ اس شخصیت نے اپنے آپ کو حقیقت اور صداقت کے ازلی اور ابدی سرچشمے سے جس کو قرآن نے حیّ اور قیوم کے نام سے یاد کیا ہے اپنے آپ کو مربوط کر لیا تھا اور اسی ربط کا یہ نتیجہ تھا کہ اس میں اپنے زمانے کے ہر لمحے ایک تخلیقی عمل کی صلاحیت تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس شخصیت کا ہر عمل کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ کا مظہر تھا۔ اس عمل میں ربط تھا لیکن تکرار نہ تھی اور اسی لئے ہر لمحہ ایک نئی تجلی کا مصداق تھا۔ یہاں ایک اہم سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا اس ربط کے جو ہمیں اس شخصیت سے ہے ہم روحانی اور تاریخی پہلوؤں کو یعنے ابدی اور زمانی پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے ہیں جو در اصل شخصیت کا روحانی بُعد زمانی عمل میں اپنا اظہار کرتا تھا اور اسی لئے یہ عمل زمانی ہوتے ہوئے بھی ابد سے مربوط تھا۔ اور اسی بناء پر یہ شخصیت تاریخ کے ہر دور میں شاہد کا فرض انجام دے سکتی ہے اور شاید یہی مفہوم والرسول علیکم شھیدا کا ہے۔ میری اس مختصر عبارت کا منشاء یہ ہے کہ ہم اپنے ربط کی معنویت کی تلاش کریں اور صرف روحانی یا تاریخی پہلو پر اکتفانہ کریں۔ یعنے نہ تاریخ سے کنارہ کشی کر لیں اور نہ صرف تاریخ کے عمل میں اپنے آپ کو گم کر دیں۔ میرے نزدیک اجتماعی اور شخصی انفرادیت کا یہی مفہوم ہے اس امر کی جانب متوجہ کروں کہ منقسم یا بٹی ہوئی شخصیت اپنی انفرادیت نہیں رکھتی اسی لئے ہر ذی نفس ''شخصیت'' کا حامل نہیں ہوتا اور محض انفرادیت کا بار بار اعلان انفرادیت کے حامل ہونے کی ضمانت نہیں بنتا شائد اس کے برعکس انفرادیت کا ایسا اعلان لاشعور کی اس مایوسی کا بھی گواہ ہو سکتا ہے کہ انفرادیت ہے ہی نہیں۔ ایسا اعلان محض ایک شخصیت کا فقدان ہے اصلی انفرادیت زمانے پر اپنے عمل کے نقوش ثبت کرتی ہے۔ اگر زمانے پر کوئی نقش موجود نہیں تو پھر انفرادیت بھی نہیں اور یہیں انفرادیت اور اجتماعیت کا ربط بھی بامعنیٰ بنتا ہے۔

اب صرف ایک سوال باقی رہتا ہے کہ کیا ہم نے تاریخ کو ''معاد'' کا مترادف تو قرار نہیں دے لیا ہے۔ اور زمانہ کے لئے اپنی شہادت اور رسول اللہؐ کے لئے ہماری شہادت کو ایک نامعلوم مستقبل یعنے صرف یوم آخرت کیلئے تو مخصوص نہیں کر دیا ہے۔ جس طرح ماضی کا ابتدائی لمحہ عدم سے قریب تر ہو جاتا ہے اسی طرح مستقبل کا انتہائی لمحہ بھی عدم سے نزدیک تر رہتا ہے اور یہ دونوں لمحات موجود کو معدوم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ کیا محمد

رسول اللہؐ سے ہماری نسبت کا منشا یہی ہے کہ ہم موجود کو معدوم بن جانے کا انتظار کرتے رہیں گے اور اگر یہی مفہوم ہے تو پھر کئی ایک روحانی شخصیتوں میں سے صرف محمد رسول اللہؐ کو چن لینے کا مطلب کیا ہے؟ ایسا انتخاب محض ایک طرح کا اضطراری قسم کا عمل ہوگا یعنے یہ کہ منتخب کرنے والے خود انتخاب کے اہل نہیں تھے۔ مختصر لفظوں میں اس انتخاب اور اس ربط کا مفہوم یہ ہے کہ ربط کا اعلان کرنے والے افراد اور گروہ ایک طرف تو انفرادی اور اجتماعی طور پر حقیقت کے سرچشمہ سے مربوط رہنے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسری طرف حقیقت سے اس ربط کو تاریخی عمل میں تبدیلی کا ایک ذریعہ یا وسیلہ بنائیں۔ موجود سے اپنے ربط کو قائم کرتے ہوئے اس امر کو فراموش نہ کریں کہ ہر موجود اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے یعنے تاریخ کا ہر ایک لمحہ ایسے عمل کا تقاضہ کرتا ہے جو اس لمحہ میں پوشیدہ خیر کو ظاہر کرنے کا ضامن بن سکے۔ اگر دنیا کی رفتار مائل بہ خیر نہیں ہے تو اس کی حرکت بذاتِ خود کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔ انسانی عمل اس حرکت میں مداخلت کرتا ہے اس کو خیر یا شر کی جانب مائل کرتا ہے اگر آج اس زمانہ کی رفتار شر کی جانب مائل ہوئے تو اس کا بہر حال علاج یہ تو نہیں ہے کہ ہم اس لمحہ حال سے بے نیاز ہو جائیں، روگردانی کر لیں اور ماضی کے اس لمحہ کو صرف یاد کرتے رہیں جہاں ایک عظیم شخصیت نے اپنے ہمعصر انسانوں کو آمادۂ عمل کرتے ہوئے تاریخ کی رفتار کو ایک نئی منزل کی جانب موڑ دیا تھا۔

یہ راستہ انفرادیت کو محفوظ رکھنے کا نہیں بلکہ انفرادیت کو تاریخ میں چھپا دینے کا ہے اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم اپنی ساری ارادی قوت اس لمحہ کو واپس لے آنے کیلئے وقف کر دیں جو ہمارا رہنما تو ہے منزل نہیں۔ ماضی ہمارا رہنما بن سکتا ہے لیکن منزل نہیں۔ منزل تو آگے کی طرف ہوتی ہے۔

ولایت و نبوت عالمِ اسلام کی ایک دیرینہ بحث

(حیاتِ ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کا آخری مضمون)

ولایت اور نبوت کے ربط اور امتیاز کی بحث، اسلامی صوفیانہ اور دینیاتی حلقوں میں ایک عرصۂ دراز سے جاری ہے لیکن میری نظر میں یہ بحث ایسے دینیاتی مباحث میں آتی ہے جس میں دونوں فریق ایک دوسرے کے امتیاز کو مبالغہ آرائی سے پیش کرتے ہیں اور اصل مبحث سے دور ہو جاتے ہیں۔

اس بحث کے نقطۂ آغاز کے طور پر میں اس دور کے مشہور فلسفی اور شاعر اقبال کے نقطۂ نظر کو پیش کروں گا، جس نے دورِ حاضر کی علمی زبان میں اس مبحث کو چھیڑا۔ اور اپنے خود راستہ سے ہٹ کر اسلام کے دینیاتی حلقوں کی تائید کر دی۔ یہاں ایک دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ اقبال نے ایک عرصہ دراز کے بعد مذہبی اور صوفیانہ تجربات کی تحقیق کی، لیکن چند محرکات کی بنا پر جن کا تعلق سماجی انقلاب سے تھا وہ وہ اس نقطۂ نظر "ولایت نبوت سے افضل ہے" کے نکتہ چیں ہو گئے، حالانکہ وہ ایک مقام پر خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "پیغمبر کی شخصیت میں حیات کا محدود مرکز خود اپنی لامحدود گہرائی میں غرق ہو جاتا ہے تاکہ وہ پھر سے ابھرے اور ایک نئے جوش و جذبہ کے ساتھ فرسودہ روایات کو ختم کرے اور زندگی کی نئی جہتوں کی پردہ کشائی کرے۔" (خطبات ص ۱۲۵) ایک دوسرے جملے میں وہ اپنے نقطۂ نظر کو اس طرح پیش کرتا ہے "کتابِ مقدس کا فہم اس وقت تک ناممکن ہے جبتک کہ وہ متبع کے قلب پر اسی طرح منکشف نہ ہو۔ جیسا کہ پیغمبر کے قلب پر ہوا تھا۔ (خطبات ص ۱۸)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض صوفیاء کے مبالغہ آمیز بیانات نے اقبال کو صوفیاء کی راہِ عام سے انحراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس ضمن میں خود اقبال نے شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے اس حیرت انگیز اور مبالغہ آمیز بیان کو پیش کیا ہے اور اسی کو نبوت کی ولایت کی برتری کی بحث میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے "محمد عربی نے اعلیٰ ترین فلک تک صعود فرمایا اور مراجعت فرمائی۔ خدا کی قسم اگر

میں اس مقام تک پہنچتا تو کبھی واپس نہ آتا" شاہ گنگوہی سے اقبال کی مخالفت بجا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اقبال نے ایک ایسی شخصیت کی مثال دی اور ان کے قول کو محققین صوفیہ سے منسلک کر دیا جو بنیادی طور پر غلط ہے۔ حالانکہ انہی خطبات میں اس نے مذہبی زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کو اس طرح پیش کیا تھا کہ مذہبی زندگی کا منتہا یہ ہے کہ "محدود انا کی اس طرح تشکیل نو کی جائے کہ وہ ابدی، حیاتی عمل سے قریب تر ہو جائے۔ اور اس طرح اپنے انا کو وہ مابعد الطبعیاتی درجہ عطا کرے جس کا ہم اپنے اس ماحول میں صرف ایک جزوی اندازہ کر سکتے ہیں" (خطبات ص۹۳) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے مذہبی زندگی کے منتہا کو سمجھنے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔ ان کا یہ بیان بھی صحیح ہے کہ پیغمبر کی مراجعت ایک تخلیقی عمل ہے۔ پیغمبر کی مراجعت کا مقصد کوئی شخصی یا ذاتی مفاد نہیں ہے بلکہ وہ زمانہ کے بہاؤ میں داخل ہوتا ہے تاکہ تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لائے اور نصب العین کی ایک نئی دنیا کی تخلیق کر سکے۔ لیکن جب وہ جاوید نامہ میں اہرمن کی زبان سے اس اسلامی محققانہ تصور کو کہ "الولایت افضل من النبوۃ"، کا ذکر کرتے ہیں جب کہ اہرمن کی خواہش یہ تھی کہ وہ زرتشت کو انجمن سے پوری طرح کھینچ لائے اور خلوت گزینی کی طرف مائل کرے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ کیوں انہوں نے زرتشت کو انبیاء کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔

یہاں دلچسپ سوال یہ ہے کہ زرتشت کے الفاظ کیا معنے رکھتے ہیں: زرتشت اقبال کی زبان میں اہرمن کو خلوت اور جلوت کے فرق کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔

چیست خلوت دردو سوز آرزوست

انجمن دید است و خلوت جستجوست

عشق در خلوت کلیم اللّٰہی است

چوں بہ جلوت می خرآمد شاہی است

خلوت و جلوت کمال سوز و ساز

ہر دو حالات و مقامات نیاز

گرچہ اندر خلوت و جلوت خداست
خلوت آغاز است و جلوت انتہاست

لیکن بدقسمتی سے یہ اشعار اس بات کو ثابت نہ کر سکے کہ "ولایت، نبوت سے کمتر ہے"۔ حضرت ابن عربیؒ نے صاف الفاظ میں ولایت کی نبوت پر فضیلت کو پیش کیا ہے۔ حضرت ابن عربیؒ کے لحاظ سے "ولایت ایک مستقل اور ناتبدیلی پذیر مقام ہے، جبکہ نبوت میں سلسلہ کے ٹوٹ جانے کا امکان رہتا ہے"۔ (فصوص الحکم عربی مرتبہ عفیفی قاہرہ ص ۶۲) وہ اس جملہ کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ "ہر پیغمبر ولایت کی جہت رکھتا ہے، جو اس کو خدا سے مربوط کرتی ہے اور ایک پیغمبرانہ پہلو ہے جو اس کو خلق سے مربوط کرتا ہے اور یہ جہت پیغمبر کے تشریعی عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی نظر میں نبی کی ولایت کی جہت ان کے پیغمبرانہ جہت سے برتر ہے صرف اس بنا، پر کہ ولایت کی وجہ سے وہ خدا سے مربوط ہوتا ہے"۔ (فصوص الحکم ص ۱۳۱ تا ص ۱۳۷) حضرت ابن عربیؒ کے اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے عفیفی یہ کہتے ہیں کہ "ولایت روحانی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہر پیغمبر ولی ہے اور ہر نبی ولایت کی جہت کا مالک ہے۔ ولایت کی جہت عرفانِ رب سے مربوط ہے، جو صوفی کی ذات میں منکشف ہوتی ہے اور پیغمبرانہ وحی سے مختلف ہے کیوں کہ تشریعی عمل اس کا مقام نہیں"۔ (التعلیقات فصوص الجزء الثانی ص ۲۴، ۲۵) ان کے لئے حضرت ابن عربیؒ کی نظر میں الانسان الکامل کا لقب صرف ولی کامل کیلئے مخصوص ہے۔ اس بنا، پر کہ وہ ذاتِ احدیت سے مکمل اتصال رکھتا ہے۔ حضرت محمد صلعم الانسان الکامل ہیں، لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ پیغمبر ہیں بلکہ اس بنا، پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکمل اتصال رکھتے ہیں۔ حضرت ابن عربیؒ تمام مسلمانوں کی طرح ختم نبوت کے عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں اور محمد رسول اللہ کو سارے پیغمبروں سے افضل مانتے ہیں۔ ان کی مخصوص ولایت کی وجہ سے، جس کو وہ الولایت المحمدیہ کا نام دیتے ہیں۔ یہی ولایت محمدیہ سارے پیغمبرانہ عرفان کا سرچشمہ ہے (فصوص الحکم ص ۲۴، ۲۵) جس طرح پیغمبروں میں رسول اللہ خاتم النبوۃ ہیں، اسی طرح ختم ولایت کا مرتبہ ہے جس کو وہ ولایت کی مہر قرار دیتے ہیں۔ اس مقام پر وہ الولایت المقیدہ اور الولایت المطلقہ میں امتیاز کرتے ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہؐ پر نبوت ختم ہوتی ہے لیکن ان کی ولایت جاری رہتی ہے تا آں کہ

خاتم ولایت محمدیہ انسانیت کے اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ بہر حال مختصر یہ کہ محمد رسول اللہؐ کی ولایت ان کی نبوت سے افضل ہے اور خاتمِ ولایت محمدیہؐ، محمد رسول اللہؐ کی ولایت کی جہت کی تکمیل کرتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ رسول اللہؐ کی مشہور حدیث لی مع اللہ وقتہ آپؐ کی سوانحی زندگی میں اعلیٰ ترین مقام رکھتی ہے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ رسول اللہؐ کی فاتحانہ شخصیت، ان کی ولایت کا ایک کرشمہ ہے اور میری نظر میں یہ تاریخی واقعہ قابل غور ہے کہ ہجرتِ رسولؐ معراجِ رسولؐ کے بعد واقع ہوئی ہے یعنے آپ کی فاتحانہ شخصیت آپؐ کی تکمیلِ ولایت کا ایک نتیجہ تھی۔ کیونکہ بحر و بر کی تسخیر اسی شخصیت کی نصیب میں آتی ہے جو خدا سے متصل ہو۔ یہاں میں یہ بھی کہتا چلوں کہ بحر و بر کی تسخیر صرف مادی مفہوم نہیں رکھتی بلکہ اس کا ایک روحانی اور باطنی مفہوم بھی ہے۔ ولایت کی یہ منزل خلق کے لئے زلزلۂ عالم افکار بن جاتی ہے۔ اور خاتم ولایت محمدیہؐ روحانی طور پر بحر و بر کی اس طرح تسخیر کرتا ہے کہ زمان و مکان کے ادنیٰ امتیازات اس کے لئے بے معنیٰ ہو جاتے ہیں اور عالمِ حق اور عالمِ خلق کو ابدیت کے سرچشمہ تک پہنچاتے ہیں اور شاید مولانا رومی نے اسی شخصیت کے بارے میں یہ اشارہ کیا تھا "منزلِ ما کبریاست"۔

حضرت ابن عربیؒ کی اس واضح بحث کے باوجود تعجب ہے کہ گیارھویں صدی ہجری کے مشہور ہندوستانی عالم دینیات شیخ احمد سرہندی نے ولایت کی فضیلت پر بہت بے احتیاطی کے ساتھ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ صوفیانہ ریاضت کے ساتھ ان کا اصل مقصد ایک سماجی اور سیاسی مشن تھا۔ شاید ایسی ہی شخصیتوں کے بارے میں غالبؔ نے کہا تھا ؎

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

وہ اصل میں خود اپنے دور کے سب سے زیادہ پرکشش اور جاذب نظر تحریک "مہدویت" پر حملہ کرنا چاہتے تھے چونکہ ان کا مقصد منفی تھا، اسی لئے انھیں اولیاء صوفیاء کے اس متفقہ ایقان سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ لیکن بہر حال چونکہ وہ اپنے آپ کو ایک صوفی اور ولی کی حیثیت سے بھی پیش کرنا چاہتے تھے اس لئے انھیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ ہر پیغمبر کی ولایت کی جہت ہوتی ہے اور جس طرح نبوت کے مدارج ہیں ویسے ہی

ولایت کے بھی مدارج ہیں۔" بالآخر وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ولایت بہرحال نبوت سے کمتر ہے۔ ان کے الفاظ میں "ہر پیغمبر کی ولایت اس کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے۔ (انتخاب خطوط سرہندی مرتبہ محمد فرمان ص ۱۰۳ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۵۸ء۔

شیخ احمد سرہندی مختلف باطنی تجربات کے مدارج کو بیان کرتے ہوئے اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ایک سالک ماسوی اللہ کے فنا کا تجربہ حاصل کرتا ہے جب وہ وجدانی تجربہ سے گزرتا ہے لیکن جس لمحہ وہ بقاء کی منزل پر پہونچتا ہے اور ارشاد کے لئے خلق کی جانب واپس ہوتا ہے تو پھر سے عالم کائنات اس کے سامنے عیاں ہو جاتی ہے (انتخاب خطوط ص ۱۴۲) یہاں بھی شیخ احمد سرہندی کو غلط فہمی ہوئی ہے انھوں نے فنا اور بقاء کو متضاد مقامات فرض کر لئے اور اسی لئے پیغمبرانہ شخصیت کو لازمی طور پر افضل قرار دیا اور انتہا انہوں نے یہ کر دی کہ مشہور حدیث "الولایت افضل من النبوۃ" کو اولیاء کا بیان قرار دیکر حالتِ سُکر کا نتیجہ قرار دیا۔ (انتخاب خطوط ص ۱۳۷) اس بحث میں ایک اور مقام پر انقباض اور انبساط کے درجات کو اس طرح مسخ کر دیا کہ قلب کا انقباض، ولایت ہے اور آگے چلکر اس طرح گل افشانی فرماتے ہیں کہ "اولیاء خلق کو فراموش کر جاتے ہیں، لیکن چوں کہ انبیاء میں کمالِ شرح صدر ہے پیغمبر حق سے منحرف ہے اور نہ خلق سے گریزاں ہے۔" (انتخاب خطوط ص ۱۶۷) یہاں پھر بحث یہ ہے کہ کیا سرہندی صاحب نے انبساط کو ان کے معروف معنوں میں استعمال کیا ہے، یا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے تحریف کی ہے؟ ان کمزور قضایا کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہونچنا کہ پیغمبر کی ولایت کی جہت کو ان کی پیغمبرانہ جہت پر فضیلت ہے بے معنی ہے کیوں کہ ان کی ولایت کا مقصد عالم انسانیت سے مکمل گوشہ نشینی ہے، جو شائد اولیا اور ان کے بعد ختم ولایت کا منشاء نہیں تھا۔

شیخ احمد سرہندی ولایت کو وضو کے مماثل قرار دیتے ہیں، جو صرف صلوٰۃ کی تیاری کے لئے ضروری ہے، اور نبوت وضو کے مقابلے میں کامل عبادت کا درجہ رکھتی ہے (انتخاب خطوط ص ۱۷۱) ان کے نزدیک ولایت، نبوت کے سامنے صرف ایک خادم کا درجہ رکھتی ہے۔ اور صاف الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ "ولایت، نبوت کی ظل کا مقام رکھتی ہے اور ولایت میں کمال، نبوت کے کمال کا ایک سایہ ہے"۔

(انتخاب خطوط ص ۲۴۷-۲۴۶)

حضرت ابن عربیؒ کے نزدیک اولیاء کے باطنی تجربوں کا سرچشمہ حضرت محمد صلعم کی ولایت محمدیہ ہے۔ یہاں یہ بات واضح ہے کہ ابن عربیؒ ہر ولی کی محض ولایت کو نبوت پر فضیلت نہیں دیتے بلکہ ولایت محمدیہ کو نبوت محمدیہ سے برتر قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے رد میں سرہندی الفاظ کے گھماؤ سے ایک دوسرا تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں "الہام کہ اولیاء اللہ را است مقتبس از انوار نبوت است واز برکات وفیوض انبیاء علیہم السلام است" ط ۲۴۶۔ ان کے اس نقطۂ نظر کا اس لئے کوئی جواز نہیں ہے کہ خود سرہندی نے نبوت اور ولایت کے نازک ترین فرق کو محسوس نہیں کیا۔ اگر وہ اس نقطہ کو فراموش نہ کر جاتے کہ اولیاء کے الہام کا سرچشمہ ولایت محمدیہ ہے اور خاتم ولایت، خاتم ولایت محمدیہ ہیں تو پھر انہیں ایک لایعنی بحث میں اتنے صفحے سیاہ نہ کرنے پڑتے اور امت کو تقرب الٰہی سے دور ہٹانے کی کوشش نہ کرتے۔

مہدویت ۔ تعبیر اسلام

(تقریر ۔ کل ہند مہدویہ کانفرنس ۔ پالن پور، گجرات ۔ منعقدہ ۱۹۶۶ء)

بزرگو اور دوستو! میں سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس کانفرنس میں شریک ہونے کا اور اپنے خیالات کو پیش کرنے کا موقع دیا۔ میں اس لیے بھی زیادہ مشکور ہوں کہ ایک ایسی کانفرنس میں کہ جس میں بزرگانِ کرام اور علمائے دین بھی شریک ہیں، آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں بھی آپ کے سامنے کچھ عرض کر سکوں۔

حضرات! مجھے زندگی میں کئی ایک کانفرنس کو ATTEND کرنے اور ان میں شریک ہونے کا موقع ملا، لیکن خصوصیت سے اس کانفرنس میں شرکت کرتے ہوئے مجھے بے انتہا مسرت اور روحانی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اور پہلی مرتبہ شائد میں اتنے ہزاروں مہدوی بھائیوں کے دل کی دھڑکنیں سن رہا ہوں اور اسی لئے میں اس اجتماع سے اپنی عمر اور جسم میں تقویت اور حرارت محسوس کر رہا ہوں۔ آج کے دور میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ لوگ اپنے آپ کو اس قابل سمجھیں کہ وہ دنیا میں زندہ رہنے اور اپنی اجتماعی قوت کو پہچاننے اور پھر اس کو برقرار رکھنے اور قوم و ملک کی ہر توانائی میں اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کریں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ابھی ابھی آپ نے ہز ہائی نس نواب صاحب، پالن پور کا خطبۂ افتتاحیہ سنا جس میں نواب صاحب نے صحیح معنیٰ میں ایک لائحہ عمل مہدی بھائیوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم ایک مذہبی گروہ ہیں اور مذہبی گروہ ہونے کا ہمیں حق حاصل ہے لیکن آپ کیلئے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اپنے ایک مذہبی گروہ ہونے پر فخر کریں۔ بلکہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ایک ایسی زندگی پر عمل پیرا ہو جائیں جو نہ صرف ہمارے لئے باعث فخر ہو بلکہ دوسروں کے لئے اپنی آپ ایک مثال بن جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ

والسّلام نے ہمارے سامنے ایک ایسا تصورِ حیات پیش کیا جس میں دنیا کی محبت کیلئے کوئی جگہ نہ دی۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ایک تو وہ فقر ہے جو انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے اور یہی وہ فقر ہے، جو رسولِ مقبولؐ کی زبان "الفقر فخری" بن جاتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا فقر وہ ہے جو رسولِ مقبولؐ کی زبان میں ثواب، اجر کا پابند بن جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان نہ صرف اس دنیا میں اپنی افادیت کھو دیتا ہے بلکہ اپنے لئے آخری "لمحہ" بھی ختم کر دیتا ہے۔ جہاں ہمیں پہلا فقر اختیار کرنا ہے، وہیں دوسرے فقر سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرنا ہے۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ آج ہمارا گروہ جس فقر کی حالت میں ہے، وہ پہلا فقر نہیں ہے بلکہ وہ دوسرا فقر ہے۔ یہ فقر وہ نہیں ہے، جو بندہ خدا کی راہ میں اپنے رب سے اپنے اختیار کے طور پر اپنا حق حاصل کر لیتا ہے۔ یہ وہ فقر نہیں ہے کہ جو بے اختیاری کا اور بے اختیاری سے اختیار کے لمحہ تک پہونچنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے بلکہ یہ وہ فقر ہے جو انسان کی بے حسی کا انسان کی سستی کا اور انسان کی کاہلی کا آفریدہ ہے اور یہ وہ فقر نہیں، جس پر آپ اور ہم فخر کر سکتے ہیں بلکہ ایسا فقر ہے، جس سے ہم کو بچنے کی کوشش کرنی ہے۔ اسی لئے میں نواب صاحب پالن پور کے ایک ایک نقطہ کی تائید کرتے ہوئے آپ سے اس بات کی درخواست کروں گا کہ اس کانفرنس پر اور اس بات پر گھمنڈ نہ کیجئے کہ ہم ایک جگہ جمع ہوئے، اکٹھا ہوئے، ایک دوسرے کی باتیں سنیں، ہم نے تقاریر سنیں اور ہم نے اچھی اچھی باتیں سنیں اور پھر ہم خوش ہو گئے۔ بلکہ اس کانفرنس سے یہ درس دیں کہ ہم اس دنیا میں اپنے لئے ایک مقام حاصل کریں اور پھر آخرت کے لئے اپنے سامان مہیا کریں۔ اسی بنیاد پر میں کانفرنس کے بانیوں کو اور اس کے انعقاد کرنے والوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور میں اس بات پر فخر محسوس کروں گا کہ ایک وہ کانفرنس ہوئی تھی جو کہ بڑی کامیاب کانفرنس تھی۔ یہ ہمارے سفر کا آغاز ہے بلکہ میں درخواست کروں گا کہ وہ ہمارے سفر کا آغاز نہیں۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے بلکہ بیسیوں مواقع ہوئے کہ آپ اور ہم ملے۔ آج میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آج کے دور میں اتحاد اور مرکزیت بہت ضروری ہے آپ اور ہم جانتے ہیں کہ ملتِ مہدیہ نہ صرف ہندوستان کے اقطاع میں بلکہ اقطاع عالم میں پھیلی ہوئی ہے، لیکن یہ عجیب وغریب بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک مقام کا مہدوی دوسرے مقام کے مہدوی سے واقف نہیں ہے۔ ایک دائرہ کا مہدوی

دوسرے دائرہ کے مہدوی سے ناواقف ہے. میں نہیں سمجھتا کہ یہ بھی ایک انتہا ہے، جس کا تعلق حضرت مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات افروز تعلیمات سے، دور کا بھی ہو سکتا ہے. مجھے اس انتشار اس افتراق اور اس تفرقہ کو دیکھکر اسبات کا خیال آتا ہے کہ "ہم بھی کوئی کھوئی گھڑی بند ہیں". جو سراسر بند ہو چکی ہے. ہم بھی ان قوموں اور ان گروہوں کی طرح ہیں جو صرف کسی ایک منصب یا نقطۂ نظر کے لئے اس بلند مطمح نظر کے پس منظر کو بھول جاتے ہیں. لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ کسی ایک گروہ کا کسی ایک نام سے وابستہ ہو جانا، اس نام کی عظمت کو نہیں بڑھاتا ہے اور نہ اس گروہ کے فروغ و عظمت کو بڑھانے کیلئے عمل کے دروازے کھولتا ہے. بلکہ ضرورت اسبات کی ہوتی ہے کہ وہ عمل یا پھر وہ تعلیم اس گروہ سے وابستہ ہو، جو کہ اس عظیم نام سے وابستہ ہے، ہم اس عمل اور تعلیم کو اپنی روح میں سمونے کی کوشش کریں اور اس کو اپنی زندگی کے لئے مشعل راہ بنائیں. اور وہ عمل، اس طرح ہماری شخصیت کا جزو بن جائے کہ ہم جو بھی کہیں اس تعلیم کا آئینہ دار ہو. اور ہمارا جو بھی عمل ہو، اس تعلیم سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کا نام ہو. اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہماری قومی زندگی میں جو انتشار ہے، جو افتراق ہے، جو تفرقہ ہے، جو پھوٹ ہے، اصنام اور ذات کے جو بت ہیں. جبتک ہم نے ان بتوں کو نہیں گرایا، جبتک ہم نے اپنے آپ کو ان سے بلند تر کرنے کی کوشش نہیں کی. میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں اپنے آپ کو مسلمان اور مہدی کہلانے کا حق حاصل ہے.

جب پہلی مرتبہ تاریخ انسانی میں، جزیرۃ العرب کے ریگزار میں ایک عجیب و غریب آواز اٹھی اور اس آواز نے ساری دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا. اور وہ آواز یہ تھی کہ سارے انسان ایک امتِ واحدہ ہیں. سارے انسان ایک آدم سے پیدا ہوئے ہیں. اور خود خدا نے صرف ان کے مابین امتیاز کی خاطر، ان کو گروہوں اور قبائل میں تقسیم کیا تاکہ یہ پہچانے جائیں لیکن تمام انسانوں میں سب سے بلند اور سب سے اکرم وہی انسان ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے. اور سب سے زیادہ خدا کی راہ میں سجدے کرنیوالا ہے. اور پھر اس کے بعد تقریباً آٹھ سو سال بعد ہندوستان کی سرزمین میں پھر ایک اور آواز اٹھی. اس آواز کا مقصد یہ تھا کہ تمام انسانوں کو پھر اس پیغام کی طرف پہنچایا جائے. عبد اور رب کے تعلقات کو استوار کیا جائے اور پھر عبد اور رب کو قریب سے قریب تر کیا جائے. اس لئے کہ جب عبد اور رب قریب ہوتے

ہیں تو پھر عبد اور عبد بھی قریب ہو جاتے ہیں. لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ جہاں عبد اور رب دور ہیں، وہیں عبد اور عبد بھی دور ہیں. اور اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ آج سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت ہماری ہے اور اس پیغام کے ماننے والوں کی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو عبد اور رب کو قریب کیا جائے تو دوسری طرف عبد اور عبد کو قریب کیا جائے. اگر آج عبد، رب سے دور ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اسی کی بناء پر عبد، عبد سے دور ہے. اسی لئے پوری مہدویت کا مقصد اور منشاء صرف یہ تھا کہ جہاں انسان اور خدا کو قریب کیا جائے، وہیں پھر انسان اور انسان کو قریب کیا جائے. لیکن جہاں ہم یہ دیکھیں کہ انسان، انسان سے دور ہے وہیں ہمیں یہ بھی محسوس کر لینا چاہیئے کہ انسان، خدا سے بھی دور ہے. وہ انسان جو دوسرے انسان کو گلے نہیں لگا سکتا، وہ انسان جو دوسرے انسان کو اپنے قریب نہیں کر سکتا. وہ انسان جو دوسرے انسان کو ذات کی بناء پر یا نسل کی بناء پر یا رنگ کی بناء پر یا جغرافیہ کی بناء پر اپنے سے دور کرتا ہے. تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں نہ تو ایمان کی حرارت ہے اور نہ تو اس کے دل میں ایمان کی مشعل روشن ہے. اسی لئے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اپنے دلوں کا جائزہ لیجئے، اپنے دلوں کا محاسبہ کیجئے، اپنے دلوں کو ٹٹولیئے اور قبل اس کے کہ آپ، اپنے آپ کو اس عظیم پیغام سے وابستہ کرنے کی کوشش کریں، قبل اس کے کہ آپ، اپنے آپ کو اس عظیم شخصیت اور عظیم نام سے وابستہ کرنے کی کوشش کریں، یہ دیکھئے کہ آپ کے دلوں میں ایسے بت تو نہیں بیٹھے ہوئے ہیں، جن کی آپ پرستش کرتے ہیں اور صرف لوگوں کو بتلانے کے لئے، دکھلانے کے لئے اور صرف اپنے کو اور اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے. آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں، ہم ایک خدا کے پرستار ہیں ہم ایک مرکز پر جمع ہونے والے ہیں. میں سمجھتا ہوں کہ ایک کہاں ہے؟ دلوں میں نفرت و کدورت کے بت بیٹھے ہوئے ہیں اور چھپ چھپ کر ان بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور جس کی وجہ سے حقیقی اسلام اور مہدویت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے. نہ صرف یہ کہ وہ خدا سے دور ہیں نہ صرف یہ کہ وہ قرآن سے دور ہیں، نہ صرف یہ کہ انسان سے دور ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی سے بھی دور ہیں اور جس کے بغیر وہ اپنے آپ کو انسان نہیں کہہ سکتے. اسی لئے میں درخواست کروں گا کہ

اسلام کے اس امتیازی پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ جس کی تجدید اور جس کے احیاء کے لئے حضور مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس دنیا میں مبعوث ہوئے تھے۔ میں اس بات کو ماننے کیلئے بالکل تیار نہیں ہوں کہ مہدویت، اسلام کا ایک فرقہ ہے۔ میں اس بات کو بھی تسلیم کرنے تیار نہیں ہوں کہ ہم ایک چھوٹا سا گروہ ہیں، جو اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتا ہے، جو اپنی ایک الگ وحدت رکھتا ہے میرا ابتداء ہی سے یہ خیال ہے کہ مہدویت اسلام کا کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ اسلام کی ایک ایسی تعبیر ہے جو ہمیں اسلام کی حقیقی روح سے قریب تر کرتی ہے۔ اگر آپ نے یہ کانفرنس اس لئے منعقد کی ہے کہ اسلام کے ایک چھوٹے سے فرقہ کو متعارف کرایا جائے تو میرا خیال یہ ہے کہ آپ نے اسلام کی خدمت کی اور نہ ہی مہدویت کی خدمت کی۔ لیکن اگر آپ نے اس طرح خدمت کی ہے کہ آپ ایک خاص پیغام کے ماننے والوں کو جو اسلام کی حقیقی روح کا آئینہ دار ہے ایک جگہ مجتمع کریں تاکہ وہ روشنی جو چند چہروں میں ہے، وہ روشنی جو چند دائروں میں ہے وہ روشنی جو چند قریوں میں ہے اور وہ روشنی جو چند شہروں میں ہے، وہ روشنی ساری دنیا میں پھیل سکے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا یہ کانفرنس کرنا، ایک فالِ نیک ہے اور قابلِ مبارکباد ہے لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس روشنی کو اور محدود کر لیں، اس روشنی کو اور سکیڑ لیں، اس روشنی کو اور منقبض کر دیں تو میرا خیال یہ ہے کہ آپ اس عظیم الشان تجدید کرنے والے کی روح کے لئے آپ شرمندگی کا باعث بن رہے ہیں۔ اس لئے کہ آج، سب سے پہلی چیز، اگر آپ سے پوچھنا ہے کہ اس دور میں جبکہ خود مذہب تمام مختلف قوتوں کے چیلنجوں کا مقابلہ کر رہا ہے جبکہ مذہب ہماری زندگی کا کوئی والین مقصد نہیں ہے جبکہ ہم اپنی زندگی کو سدھارنے کے لئے، زندگی کو تربیت دینے کے لئے، زندگی کی تہذیب کرنے کیلئے مذہب کو بنیادی اہمیت نہیں دیتے رہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دور میں جبکہ مذہب ہر طرف سے مختلف چیلنج کا مقابلہ کر رہا ہے تو پھر کس طرح مذہب کی تعلیمات کو پیش کریں اور کس طرح ہم مذہب کو عام کرنے کی کوشش کریں۔ ایک دور وہ تھا، جبکہ انسانی زندگی کی سب سے بنیادی تہذیب سب سے بنیادی ضرورت تھی۔ اس دور میں مذہب کی بات کرنا، آسان نہ تھی لیکن عام صورتحال یہ ہے کہ مذہب مدافعت کر رہا ہے۔ مذہب زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے مذہب زندہ رہنے کی کشمکش کر رہا ہے۔

مذہب کو مختلف قوتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ ایک طرف تو سب سے بڑی سب سے عظیم الشان قوت ہے جس کو ہم سائنس کی قوت کہتے ہیں۔ اسی طرح سیاست کی قوت ہے۔ دوسری طرف اقلیت اور اکثریت کی قوتیں ہے، جن کا مذہب کو مقابلہ کرنا ہے۔ یہ قوتیں صرف اتنی حقیر نہیں ہیں کہ ہم صرف ان کا تبرا کریں، ان کا ماتم کریں اور بیٹھ جائیں۔ یہ قوتیں عظیم الشان قوتیں ہیں۔ اور میں یہاں تک آپ کے سامنے عرض کروں گا، اگر آپ اس کیلئے تیار ہیں تو یہ ایک خدا کی مشیت کا اظہار ہیں۔ اگر آپ سائنس اور مذہب کو چیلنج کریں اور اس کے نتیجہ میں اگر آپ چاہتے ہیں کہ مذہب، سائنس کے مقابل کبھی شکست نہ پائے۔ تو آپ محسوس کریں کہ مذہب کبھی کبھی مدافعت کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اپنی ہار مانتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سائنس نے انسان کو گمراہ کر دیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مذہب کے اصلی پیغام کو اور مذہب کی اصلی روح کو سمجھنے سے انکار کر دیا ہے۔ سائنس ہمارے سامنے چند معروضی طاقتوں کو پیش کرتی ہے۔ OBJECTIVE LAWS کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ سائنس اسبات کا اظہار کرتی ہے اور اس کو ثابت کر دکھاتی ہے لیکن اس کے برخلاف جب ہم مذہب کی دنیا میں آتے ہیں تو عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ مذہب جو اسبات کا دعویٰ لیکر دنیا میں آیا تھا اور وہ تمام مذاہب جو اس بات کا دعویٰ لیکر وجود میں آئے تھے کہ ہم ایک ابدی طاقتیں ہیں، ہم واضح حقیقتیں ہیں، ہم ایسے عقائد ہیں کہ جن کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے جب انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو ہر طرف سے شک و شبہ کے دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ ان میں ایک مذہب نہیں ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ ادھر آؤ میں تمہاری نجات کے سامان مہیا کروں گا، ادھر آؤ کہ میں تمہارے لئے جنت کے دروازے کھولدونگا، ادھر آؤ کہ میں تمہارے لئے جہنم کے دروازے بند کر دوں گا۔ ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں کہ ادھر آؤ میں تمہارے لئے جنت کے دروازے کھولدوں گا۔ جنت ایک ہے۔ جہنم ایک ہے اور آوازیں کئی ہیں۔ انسان پریشان ہے اسے بچنا ضروری ہے۔ اسی لئے دوسرا انسان جنتوں کی تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن ایک روح کی بھی آواز ہے کہ آئندہ زندگی میں بھی روح کا ارتقائی سفر جاری رہے۔ انسانی روح کا تقاضہ یہ ہے کہ اس دنیا کو جنت زار سے بنایا جائے اور دوسری طرف اس کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ آنیوالی زندگی جہنم بننے نہ پائے اور انسان ان جنتوں سے

بخوبی گزر جائے۔ یہ تقاضے روح کے تقاضے ہیں اور ان تقاضوں کی بناء پر مذہب باوجود اس کے کہ ان تمام طاقتوں کے برسرِ آزما ہے اور جبتک انسانوں کی روح کو مذہب سے تشفی حاصل ہوتی رہے گی اس وقت تک زندہ قوت کی حیثیت سے باقی رہیگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان مختلف آوازوں میں انسانی روح، اگر کھو جائے تو پھر وہ کیا کرے؟ اور آج واقعہ یہ ہے کہ میں ان تمام لوگوں سے جو یہاں موجود ہیں عموماً اور علمائے کرام سے خصوصاً یہ درخواست کروں گا کہ اس بات پر غور کریں کہ اگر آج انسانی روح ان آوازوں میں کھو جاتی ہے تو پھر کیا کرے کہ سوائے اس کے کہ انکار کر جائے۔ آج کا انسان جو انکار کر رہا ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ اس انکار سے انسان ابلیسی قوتوں کے آگے ہتھیار ڈال رہا ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ بالآخر انسان پر ابلیس کامیاب ہو گیا۔ لیکن اگر انسان واقعی خدا کی مخلوق ہے، اگر وہ خدا کا آفریدہ ہے، اگر وہ خدا کی تخلیق ہے تو پھر کوئی ابلیسی قوت، کوئی شیطانی قوت، انسان پر بالآخر کامیاب نہیں ہو سکتی ہے بالآخر فتح یاب نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آج کا انسان انکار کر رہا ہے لیکن اگر آج کا انسان اندھیروں میں بھٹکا ہوا ہے اور اگر مختلف آوازوں کے ہجوم میں گھبرا کر انکار کر تا ہے تو اسبات کو سوچیے کہ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انمیں سے کسی ایک آواز میں بھی اثر باقی نہ رہا۔ یہ جتنی آوازیں آ رہی ہیں اور جو پکار پکار کر کہتی ہیں کہ ادھر آؤ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان آوازوں میں کوئی اثر نہیں ہے۔ اسی لئے آج کا انسان انکار کر رہا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ آج ایک مذہب کمزور ہے تو دوسرا مذہب طاقتور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام مذاہب کمزور ہو چکے ہیں اور تمام مذاہب کے پیرو، میں سمجھتا ہوں کہ صرف اپنے ایک بیجا گھمنڈ کو اور ایک بیجا تاریخی غرور کو JUSTIFY کرنے کے لئے، وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی گروہ سے وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو میرا خیال ہے کہ ہم سیاسی طور پر مسلمان ہیں۔ اس لئے کہ ہم مسلمان کے نام سے کچھ حقوق حاصل کر لیں کچھ ہمارے تاریخی گھمنڈ اور تاریخی فخر ہیں کہ جس کو ہم JUSTIFY کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جتنے تمام مذہبی گروہ ہیں وہ صرف ماضی کے ایک بوجھ کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور وہ اس بوجھ کے ڈھکیلنے اور اس بوجھ کو اتارنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کے راستہ میں ان کا گھمنڈ اور غرور حائل ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج کسی مذہبی گروہ میں بھی حقیقی معنیٰ میں نہ تو اثر ہے اور نہ آواز میں قوت ہے۔

کچھ آوازیں آتی ہیں کہ ادھر آؤ کی آوازیں۔ یہ روح سے نہیں آرہی ہیں۔ یہ مذہبی پیشواؤں کی روح کی آوازیں نہیں ہیں بلکہ، میں آپ کے سامنے ایک بات عرض کردوں کہ، یہ آوازیں صرف ایک تاریخ کی صدائے بازگشت ہیں۔ ہر شخص ان آوازوں کو سنتا آیا تھا اور ہر شخص یہ آوازیں آج بلند کر رہا ہے، اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ جہاں انسان سیاسی قوتوں کے پیچھے جمع ہو جاتا ہے آج مذہبی پیشوا کے پیچھے انسان جمع نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت جمع ہوتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آباء و اجداد بھی جمع ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج کا انسان کسی بھی آواز کی طرف توجہ نہیں کر رہا ہے۔ اسی لئے میں ایک بات عرض کروں۔ کیا خدائی مشیت یہی ہے کہ انسان اسی طرح بھٹکتا رہے۔ مختلف آوازوں کے ہجوم میں وہ دب جائے اور ہر آواز اس کو اجنبی محسوس ہو لیکن جب ہم قرآن کی ورق گردانی کرتے ہیں CASUAL READER کی حیثیت سے کبھی کبھی پڑھنے والے کی حیثیت سے، جو کہتا ہے کہ "گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را" ایک مقام پر ہماری نظر رکتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا یہ فرمان، یہ قرآنی آیت ہمیں ملتی ہے کہ "ان الدین عند اللہ اسلام" "خدا کے نزدیک دین، اسلام ہے"۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنے پیغام آئے تھے، کیا وہ جھوٹے تھے؟

ہم نے بدقسمتی سے اسلام کو ایک تاریخی پیغام سمجھ رکھا ہے کہ جس کو جزیرۃ العرب کے ریگزار میں ایک خاص موقع پر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ اور اگر واقعی یہ بات ہے کہ خدا کے نزدیک ایک ہی دین ہے اور وہ اسلام ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تک جتنے پیغام آئے تھے تو کیا وہ جھوٹے تھے، کیا ان میں صداقت موجود نہیں تھی، کیا وہ سچے نہیں تھے۔ لیکن جب ہم قرآن کو قرآن کے ذریعہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کو قرآن کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام، کوئی ایک نیا پیغام نہیں تھا۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم، دنیا میں ایک نیا فرقہ قائم کرنے نہیں آئے تھے۔ یہودی اور عیسائی اس دنیا کو تباہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ رسول اللہ، مسلمانوں کا ایک اور فرقہ بنانے کے لئے نہیں آئے تاکہ جہاں دو فرقے لڑ رہے تھے۔ جہاں دو قوتیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھیں۔ وہاں ایک تیسری قوت بھی داخل ہو جائے اور

ساری دنیا کو جہنم میں تبدیل کر دے۔ بلکہ رسول مقبول کا سب سے بڑا اور اہم ترین MISSION یا مقصد یہہ تھا کہ دنیا کو ایک نکتہ پر جمع کریں۔ گویا اسلام، اصل میں، نام اس بات کا تھا کہ بھٹکی ہوئی اور بھولی ہوئی انسانیت کو اس کے اصلی نصب العین سے واقف کروایا جائے۔ اسی لئے ایک نئے فرقہ کا آغاز نہیں تھا۔ ایک نئے گروہ کا آغاز نہیں تھا۔ ایک نئی تہذیب کی ابتدا نہیں تھی۔ بلکہ ایک ایسے نئے روحانی پیغام کی اشاعت تھی جس کی بنیاد پر ایک بھٹکی ہوئی اور منقسم انسانیت جمع ہو سکے۔

اسی طرح جب اسلام آیا، جب اسلام پیش ہوا اور خصوصاً رسول مقبول کے زمانے میں، میں مختصراً عرض کروں گا کہ رسول مقبول نے اس کو دو طریقوں سے پیش کیا۔ اس کو میں استعارہ کی زبان میں یوں کہوں گا ایک وہ طریقہ تھا کہ جو آپ نے دن میں بتایا۔ ایک وہ طریقہ تھا کہ جو آپ نے رات میں بتایا۔ اور ہر پیغمبر کی زندگی میں یہہ دو عجیب و غریب مقام آتے ہیں۔ یوں کہیئے کہ پیغمبر کا، رسول کا کہ جہاں تک وہ رسالت ہے۔ ان دو عجیب و غریب انتہاؤں کے درمیان میں ایک طرح سے TENSION کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف تو دن کی زندگی ہے۔ ایک طرف تو رات کی زندگی ہے۔ ایک طرف تو وہ زندگی ہے جبکہ رسول مقبول اپنے مشن کے ساتھ مصروف و مشغول ہیں۔ آپ کے ذمہ کچھ SOCIAL فرائض بھی ہیں۔ ایک حیات اجتماعی کی تشکیل دینی ہے۔ ایک ایسے گروہ کو قائم کرنا ہے جو اس پیغام کا ایک عملی نمونہ بن جائے اور وہ گروہ ایک خاص تاریخی گروہ ہے۔ وہ گروہ ایک خاص جغرافیائی گروہ۔ ہے اس گروہ کی چند خاص طاقتیں ہیں اور چند خاص کمزوریاں بھی ہیں اور انہی طاقتوں اور انہی کمزوریوں کو لیتے ہوئے اور ان کو اپنے آپ میں سمیٹے ہوئے، رسول مقبول کو ایک نئے تاریخی گروہ کو جنم دینا ہے۔ لیکن اس تاریخی گروہ کو اس لئے جنم دینا ہے کہ وہ آنیوالی انسانیت کیلئے نمونہ بن جائے۔ لیکن یہہ وہ مقام ہے جہاں رسول مقبول دوسرے انسانوں سے قریب تر ہیں لیکن ایک ایسا موقع آتا ہے، جس کو میں، رسول مقبول کی رات کی زندگی کہوں گا جبکہ رسول مقبول یہہ کہتے ہیں کہ "مجھ پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جبکہ مجھ میں اور میرے رب کے درمیان ملائکہ مقربین بھی موجود نہیں رہتے"۔ ایک تو وہ وقت ہے جبکہ آپ ہیں اور پھر آپ کے ماننے والے موجود ہیں۔ وہ ماننے والے موجود ہیں کہ جن کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالنا ہے۔ پھر ایک وہ وقت آتا ہے جبکہ آپ کے ساتھ نہ آپ کے ماننے والے موجود

ہیں اور نہ ملائکہ مقربین موجود ہیں بلکہ آپ ہیں اور رب ہے۔ اب زندگی کے یہ جو دو راستے ہیں ان دونوں میں تاریخ اسلام میں ایک قسم کا TENSION پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر ایک طرح کی CONFLICT پیدا ہوتی ہے، جس کو ہم شریعت اور طریقت کے CONFLICT کا نام دیتے ہیں۔ وہ اسلام، جو تمام انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے آیا تھا۔ وہ اسلام مختلف فقہی مکاتیب میں مختلف فقہی مدارس میں اور مختلف صوفیانہ سلسلوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ آوازیں منقسم ہو جاتی ہیں اور وہ ایک جو آواز آئی تھی اور جو ایک بار ریگزار عرب میں اٹھی تھی اور جس نے کہا تھا کہ ادھر آؤ "تعالوا الیٰ کلمۃ سواءٍ بیننا وبینکم" ایک کلمہ کی طرف بلانے کی کوشش کی تھی۔ پھر اسی آواز سے کئی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

کلمہ ایک ہے لیکن عجیب و غریب صورت حال تاریخ اسلام میں پیدا ہوتی ہے۔ مثال میں آپ کو صرف ایک دوں گا۔ ایک طرف حق پرستوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا کلمہ پڑھتی ہے۔ دوسری طرف ہزاروں انسانوں کا ایک مجمع ہے۔ اور اس چھوٹی سی حق پرستوں کی جماعت پر وہی ہزاروں کا مجمع لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا کلمہ پڑھتے ہوئے سنگینوں اور پتھروں کی بارش کرتا ہے۔ اور یہ واقعہ بہت دور کا نہیں ہے رسول مقبول کے وصال کے (۶۱) سال بعد واقع ہوتا ہے۔ یہ بھی تاریخ اسلام کا ایک جز ہے۔ پھر اور انداز تاریخ اسلام کے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بہرحال بہت جلد ایسا موقع آتا ہے کہ اسلام مختلف مکاتیب میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور پھر ہر ایک صداقت کا اجارہ دار بن جاتا ہے۔ ہر ایک کی آواز یہ ہے کہ میں ہی حق کی صحیح تعبیر ہوں لیکن اس پورے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے مجمع میں کوئی ایک ایسا حق پرست نہیں ہوتا، جو اٹھ کر یہ پوچھے کہ حق تو ایک معروضی چیز ہے حق تو وہی ہے۔ لیکن تمہاری تعبیریں، تمہاری عقل ناقص کی تعبیریں چاہے تم کتنے بڑے امام صحیح، چاہے تم کتنے بڑے مجتہد صحیح۔ لیکن تمہاری اس تعبیر کو حق کی قطعی اور آخری تعبیر کس نے بنایا۔ تمہارے پاس کونسی ایسی سند موجود ہے جس کی بنا پر تمہاری تعبیر کو میں حقیقت کی آخری تعبیر قرار دوں اور تم اس بات پر اصرار کرو کہ میں اگر تمہاری بات نہیں مانی تو میں حقیقت سے دور ہو گیا پھر ان آوازوں میں اسلام بھٹک جاتا ہے۔

پھر یہاں سے ایک ایسا وقت آتا ہے جب کہ واقعی دین اور دین کے مقاصد صرف مجذوبوں میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ صرف چند مجذوب ہیں، جو دین کے حقیقی مقاصد سے واقف ہیں پھر ایسے موقع پر حضرت مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام، دین کے حقیقی مقصد سے انسانوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں مختصراً یہ عرض کروں کہ دین کا یہ وہ حقیقی مقصد ہے، جو کہ صرف رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد نہیں تھا۔ بلکہ ان تمام پیغامات کا حقیقی مقصد تھا، جو ارض ہند میں بھی آئے، جو چین میں بھی آئے، جو عرب میں بھی آئے، جو شام میں بھی آئے، جو مصر میں بھی آئے اور جو تمام دوسرے ملکوں میں بھی آئے۔ یہی وہ حقیقی مقصد دین ہے جس پر ساری انسانیت جمع ہو سکتی ہے۔ یہ صرف اسلام کی، تاریخ اسلام کی روح نہیں ہے، تاریخ اسلام کا منشاء نہیں ہے بلکہ اس اسلام کا منشاء ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کی آیت ہے کہ "ان الدین عند اللہ اسلام"۔

اسی لئے میں عرض کروں گا، آپ کے سامنے کہ مہدویت، اسلام کا کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کی وہ تعبیر ہے۔ اسلام کا وہ حقیقی منشاء اور وہ حقیقی مقصد ہے، جو ہمیں نہ صرف اسلام بلکہ "الدین"، جیسا کہ قرآن مجید نے الدین کا نام دیا ہے۔ وہ اسکی حقیقی روح سے ہمیں قریب کر دیتا ہے۔ اگر آپ SHOCK محسوس نہ کریں تو عرض کروں یہ قرآن کی وہی تعبیر ہے۔ یہ وہی معنی ہیں، جو مختلف روپ میں، مختلف اشکال میں آپ کو دنیا بھر کے ادیان کی روح میں نظر آئیں گے۔ یہ وہی پیغام ہے جس کی جھلک ممکن ہے کہ آپ انجیل میں دیکھیں، جس کی جھلک ممکن ہے کہ آپ توریت میں دیکھیں، جس کی جھلک ممکن ہے کہ آپ زبور کے نغموں میں سنیں، جس کی جھلک کبھی کبھی ممکن ہے کہ آپ ہندوستان کی مقدس کتاب اپنشد میں دیکھیں، جس کی جھلک ممکن ہے کہ آپ گیتا میں دیکھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی گونج آپ کو مصر میں سنائی دے۔ یہ گونج ممکن ہے کہ آپ کو کسی اور ملک میں سنائی دے لیکن راستے اتنے کٹھن بنائے اور راستوں کو اتنا مشکل بنایا کہ عید صرف عید رہا لیکن وہ رب تک نہیں پہنچ سکا۔

مذہب کا مقصد یہ نہیں تھا، دین کا مقصد یہ نہیں تھا کہ عید صرف عید ہے بلکہ مذہب کا

مقصد یہی تھا کہ عبدؑ عبد رہتے ہوئے، رب کے قریب پہنچا دیا جائے جب تک عبد صرف عبد رہتا ہے رب اس کے لئے ایک سوال ہے۔ لیکن جب عبدؑ بندہ اور انسانؑ پر خلوص طریقہ پر ایک تلاش کرتا ہے ایک حقیقت مطلق کی۔ تو پھر رب سوال نہیں رہتا بلکہ وہ جواب بن جاتا ہے۔ دین کا اصلی مقصد یہ تھا کہ جو سوال ہے اور جو انسانی روح کو ہمیشہ تڑپاتا رہتا ہے۔ اس سوال کا ایک ایسا جواب پیش کیا جائے جو صرف ایک مفروضہ نہو۔ جو صرف ایک عقیدہ نہو بلکہ ایک زندہ حقیقت ہو۔ مذہب ہم تمام لوگوں کے لئے ہے۔ خدا ہم سب لوگوں کے لئے ہے جو یہاں موجود ہیں۔ چند استثنائی صورتوں کے علاوہ ہم سب کے لئے ایک POSTULATE مفروضہ ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ساری کائنات بغیر ایک خالق کے زندہ نہیں رہ سکتی یہ سارا انظامِ عالم بغیر ایک ناظم کے باقی نہیں رہ سکتا۔ ایک منطقی مفروضہ ہے۔ لیکن یہ منطقی مفروضہ ایمان کو ایمان بنانے کے لئے کافی نہیں۔ انسان کو مذہبی بنانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اصلی ایمان تو اس وقت پیدا ہوگا جبکہ خدا ایک مفروضہ نہ رہے۔ یہ ایک PHILOSOPHICAL POSTULATE نہ رہے یہ ایک مفروضہ نہ رہے۔ بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت بن جائے۔ اسی لئے مہدی موعودؑ نے کہا کہ "ایمان سوائے دیدار کے اور کچھ نہیں" اس لئے کہ اس کو مذاہب نے اور مذاہب کے ماننے والوں نے خدا کو ایک مفروضہ بنایا تھا۔ اور جو ہم سب کے لئے ایک مفروضہ ہے۔ دین اس کو چاہتا ہے کہ زندہ حقیقت بن جائے اور اسی مقام پر دین کے حقیقی معنے اور دین کا حقیقی مقصد ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسی لئے میں نے جہاں پہلے یہ بات عرض کی کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو دنیا کے سامنے اس لئے نہیں پیش کیا کہ دنیا میں ایک نئے تاریخی گروہ کا اضافہ ہو۔ اور اسی طرح جب میں نے آپ کے سامنے یہ بات کی کہ مہدویت اسلام کا فرقہ نہیں ہے۔ جہاں رسول مقبول کا پیش کیا ہوا اسلام، سارے ادیان کی روح کو پیش کرتا ہے وہیں مہدی موعودؑ کا پیغام سارے ادیان کے مقاصد کو، سارے ادیان کے مقصد کو اور اس کے اصلی منشار کو، اس کے اصلی مفہوم کو پیش کرتا ہے۔ اسی لئے آج کی اس کانفرنس میں جمع ہونے والے میں اپنے مہدوی بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے آپ کو ایک چھوٹا فرقہ سمجھکر، اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھیں بلکہ وہ یہ سمجھیں کہ وہ ایک مشن ہیں، وہ ایک تحریک ہیں، وہ ایک تعمیر پیش کرنے والے ہیں۔ اور جب تک

ہم اس تعبیر کو پیش نہیں کریں گے اور اس کے امکانات کا جائزہ نہیں لیں گے۔ اس وقت تک میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف انسانیت کی خدمت نہیں کر سکیں گے بلکہ ہم اسلام کی خدمت بھی نہیں کر سکیں گے۔ آخری بات جو میں آپ کے سامنے عرض کروں وہ یہ ہے اور وہ سب سے اہم بات ہے جس کے ذریعہ ہم اسلام کو سمجھ سکتے ہیں اس کی مشکلات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کا بہترین حل مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش کیا جب آپ کے سامنے سوال رکھا گیا کہ "مذہب شما چیست" یعنے آپ کا مذہب کیا ہے۔ تو آپ نے عجیب و غریب بات کہی کہ 'میں کوئی نیا مذہب نہیں لایا ہوں۔ میرا مذہب۔ مذہب ما کتاب اللہ و اتباع رسول اللہ'۔ پھر سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب آپ ایک نیا مذہب نہیں لائے ہیں تو پھر آپ کے پیغام کا مقصد کیا ہے؟ لیکن اگر ہم آپ کے جواب کے اس پورے حقیقی معنے کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور دعا کریں کہ ہم سمجھ جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی جملہ مشکلات کی کنجی آپ کے اور میرے ہاتھ میں ہے۔ آج اسلام کے جو فرقے ہیں اور جو مختلف مذاہب ہیں۔ اگر آپ ان کا جائزہ لیں تو آپ محسوس کرینگے کہ انہی مختلف مذاہب اور انہی مختلف مکاتیب کے بوجھ سے اسلام کی روح دبی جا رہی ہے۔ اور میں آپ کے سامنے عرض کروں' اگر آپ برا نہ مانیں۔ اسلام کی روح ایک نئے خالق کی منتظر نظر آتی ہے۔ کیوں ایک نئے خالق کی منتظر ہے؟ اور کیوں اسلام کی روح دبی جا رہی ہے؟ اس کی اصلی وجہ یہ ہے جیسا کہ میں نے پہلے آپ کے سامنے بات رکھی تھی اسلام کے ایک خاص MOMENT کی اسلام کے ایک خاص لمحہ کی ان مختلف تعبیروں نے قطعیت اور آخریت حاصل کر لی ہے۔ اسلام کا قانون' جس کی بنا پر اسلامی فقہ تدوین ہوئی۔ اسلام کی پوری زندگی کا یہ ایک لمحہ ہے ایک MOMENT، جو سارے اسلام کو محیط نہیں ہوتا ہے لیکن اس ایک MOMENT نے اس ایک لمحہ نے پورے اسلام پر چھا جانے کی کوشش کی اور پھر اس ایک لمحہ کی مختلف تعبیروں نے پورے اسلام کی روح پر چھا جانے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سارا عالم اسلام منتشر ہے۔

میں نے چند دنوں پہلے حیدرآباد میں کوشش کی اور مختلف گروہ کے علماء سے ملاقات بھی میں نے کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آج مختلف گوشوں سے آواز آ رہی ہے کہ مسلم پرسنل لا (MUSLIM

(UNIFORM PERSONAL LAW) میں ترمیم کی جائے۔ یا یہ کہ ایک یونیفورم سیول کوڈ (CIVIL CODE) پورے ہندوستان میں نافذ کیا جائے۔ سوال دراصل یہ ہے، اور یہ سوال ہمارے لئے بڑا جذباتی سوال بن گیا ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں کافی STUDY کی مطالعہ کیا۔ میں نے علماء سے کہا کہ اسلام، نام نہ حنفیت کا ہے، نہ شافعیت کا ہے، نہ مالکیت کا ہے، نہ حنبلیت کا ہے اور نہ جعفریت کا ہے۔ اسلام تو ان تمام لمحوں پر محیط ہے۔ کیا اس بات کا امکان ہے کہ ہم آج کے جو موجودہ مسائل ہیں، جن کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے مسلمانوں کے شخصی زندگی سے ہے (PERSONAL LAW) سے ہے۔ ان کا ہم مطالعہ کریں اور پھر ہم اس بات کی کوشش کریں کہ ان تمام مسائل کا، ان تمام مشکلات کا، جو آج ایک عام مسلمان کو پیش ہو رہی ہیں حل تلاش کریں۔ کیا اس بات کا امکان ہے کہ ہم کسی ایک فقہی مکتب کے اسیر ہونے کی بجائے، اس میں مقید ہونے کی بجائے ہم تمام فقہی مکاتیب کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ اگر یہ ممکن ہے کہ جو مسئلہ ہمیں لاینحل نظر آتا ہے، حنفی فقہ کے لحاظ سے، ممکن ہے کہ وہ مسئلہ حل ہو جائے شافعی فقہ میں۔ ممکن ہے دوسرا مسئلہ حل ہو جائے مالکی فقہ میں، ممکن ہے تیسرا مسئلہ حل ہو جائے حنبلی فقہ میں اور چوتھا مسئلہ ممکن ہے کہ جعفری فقہ میں حل ہو جائے۔ کیا اس بات کا امکان نہیں ہے؟ کیوں کہ یہ وقت کا تقاضہ ہے ورنہ اس بات کا امکان ہے کہ ملک کی سیاسی جماعت، مقتدر جماعت، ان کا حل سیاسی طور پر تلاش کرلے اور جس کی وجہ سے مسائل اور گمبھیر ہو جائیں۔ ان علماء سے مجھے عجیب و غریب جواب ملا۔ مجھ سے کہا گیا کہ نہیں۔ یہ ناممکن ہے اس لئے کہ جو حنفی ہیں۔ ان کے لئے فرض ہے کہ امام ابوحنیفہ کے فقہ پر حل کریں اور جو شافعی ہیں ان کے لئے فرض ہے کہ امام شافعی کے فقہ پر حل کریں۔ لیکن میں نے ایک بات عرض کی کہ اگر واقعی حنفی کے لئے فرض ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ کے فقہ پر عمل کرے اور تمام دوسرے مکاتیب کے لئے فرض ہے کہ ان کے اپنے مکتب پر عمل کریں، تو میں نے ان علماء سے کہا کہ پھر واقعی اگر اسلام ایک چیالنج کا مقابلہ کر رہا ہے تو پھر اس میں آپ جواب قرآن مجید میں ڈھونڈیں گے یا آپ فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ مالکی، فقہ حنبلی اور فقہ جعفری میں ڈھونڈیں گے۔ اور مجھے صاف

جواب یہہ نظر آیا کہ " ما مذہب نو نوار دیم " " مذہب ما کتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ " کہ یہہ فقہی مکتبوں میں اسلام مقید نہیں ہے۔ آج سب سے بڑا چیالنج، جس کا اسلام کو مقابلہ کرنا ہے اور جس کی وجہ سے آج اسلام میں خود انتشار ہے۔ کیا آج ہم مسلمانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتے؟ میں اپنے علماء سے درخواست کروں گا۔ آپ اس امکان کا جائزہ لیجئے۔ جب آپ کے ہاتھ میں کنجی موجود ہے۔ کیا آپ مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے قابل نہیں ہیں؟ اور مجھے یقین ہے کہ اگر ہم نے اس کنجی سے اس قفل کو کھولنے کی کوشش کی تو پھر ہم نہ صرف یہہ کہ ایک بڑے مسئلہ کو حل کرینگے بلکہ ہم ممکن ہے، اس بات کا بھی امکان ہے کہ ہم ایک MODEL قسم کا، ہم ایک نمونہ کے قسم کا، ہم یکساں قانون دنیائے اسلام کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن یہہ اس صورت میں ممکن ہے جب کہ ہمارا اور سارے مسلمانوں کا ایک ہی نصب العین ہو کہ " مذہب ما کتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ "۔ اور یہاں ایک عجیب و غریب بات ہے جس کی طرف اشارہ کروں کہ پوری اسلام کی تاریخ میں جہاں الفاظ بڑے اہم ہوئے ہیں۔ وہیں الفاظ جو ہیں، وہ حقیقتوں کے اوپر غلاف کا بھی کام دیتے رہے ہیں۔ جن میں سے ایک لفظ تھا اور جو انتہائی اہم لفظ تھا۔ لیکن جو انتہائی طور پر اسلام کے آئندہ امکانات کو بند کرنے کا ذریعہ بنا۔ وہ " سنت " کا MECHANICAL تصور اس لئے مہدی موعودؑ نے کہا " مذہب ما کتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ "۔ اسی لئے کہ جب میں اتباع محمد رسول اللہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو میں صرف رسول اللہ کے ظاہری عمل کو، جس کے بارے میں کئی ایک اختلافات ہیں، ان تک اور اس حد تک پہونچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ میں رسول اللہ کی روح مبارک سے ہمکلام ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں آپ کے ان مقاصد کو جاننے کی کوشش کرتا ہوں جن کی بناء پر آپ نے اس پیغام کو پیش کیا تھا۔ اور جس پیغام نے پوری دنیا کے لئے ایک عظیم الشان انقلاب کا باعث بنا تھا۔ اور جو پیغام ایسا تھا کہ جس کے ماننے والوں کی نگاہیں زلزلۂ عالم افکار بنی ہوئی تھیں۔ اقبال نے کہا تھا کہ مہدی وہی ہوگا کہ ـــ " ہو جس کی نگاہ زلزلۂ عالم افکار "۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے مہدی موعودؑ کی حیات اور پیغام کو دیکھتے ہیں تو یہہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے MECHANICAL طریقہ سے دنیا کو عدل

سے نہیں بھرا بلکہ صحیح معنوں میں آپ کی فکر اور نگاہ زلزلۂ عالمِ افکار رہی ۔ اگر آپ اس معیار پر مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے پیغام کو دیکھنے کی کوشش کریں لیکن اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ خود ہم اپنے دلوں کا جائزہ لیں . اور پھر اس کے بعد اگر آپ اس پیغام کو محسوس کرنے کی اور جاننے کی کوشش کریں تو آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ واقعی ایک بڑا انقلابی پیغام تھا. اور ان تمام لوگوں کے لئے اس میں نجات اور روح کے سامان مہیا ہیں، جو واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ

دنیا کو خدا کی ضرورت ہے اور خدا کو انسان کی ضرورت ہے . شکریہ

انسانی شخصیت

قرآنی دعاؤں کی روشنی میں

قرآن کی رو سے انسان، اس کائنات کی ایک ایسی حقیر مخلوق نہیں ہے، جو اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پشت پر لادے ہوئے اس زمین پر اپنے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے وہ گناہ جن کا، اس نے اس زمین پر اپنے سفرِ حیات کے آغاز سے پہلے ارتکاب کیا۔ وہ گناہ جس کا وہ اسی زمین پر اپنی پچھلی زندگی میں مرتکب رہا۔ ساری انسانی مصیبتوں، اس کے غم و الم اور اس کے رنج و محن کا سبب، نہ اس کی فطرت بد ہے اور نہ اس کی خواہش، اس کی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں، جو حیات کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہیں بلکہ اس کے درد و غم کا سبب، اس کا پہلا بلند حوصلہ، اس کی مہم پسندی اس کی مشکل پسندی، اپنے بنیادی، ہر چند کہ محدود ارادے اور اختیار کا حوصلہ مندانہ استعمال ہے۔ انسانیت پر قرآن کے اور جہاں بہت سے احسانات ہیں، وہیں اس کا سب سے اہم احسان یہ ہے کہ اس "کتاب" نے اس کو اس افسردہ کر دینے والے تصور سے آزاد کیا، جو عام طور پر "مذہبی شعور" کے ساتھ وابستہ تھا کہ انسانی سرشت ہی میں بدی اور گناہ کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ وہ لاکھ کوشش کرے اس زندگی میں وہ اس بنیادی بدی اور عنصری گناہ (ORIGINAL SIN) سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اس "مذہبی تصور" نے لازمی طور پر قنوطیت اور یاسیت کے رجحانات پیدا کئے اور یہ رجحانات مذہب کے ساتھ اس طرح چمٹ گئے کہ مذہبی تصور اور مذہبی طرزِ فکر، کسی نہ کسی طرح ایک یاس پسند اور قنوطی تصور کا باعث بن گیا۔ ہر چند کہ اس تصور نے، انسانی زندگی کے ابتدائی تاریک دور میں ایک بے روح دنیا میں، انسان کو ایک جذباتی سہارا اور ایک بے حس دنیا میں انسان کو غم و الم کی ناگزیری سے پیدا ہونے والا، ایک روحانی اطمینان عطا کیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

انسان کی قوتِ عمل اور اس کی مجاہدانہ روح پوری طرح سلب ہوگئی۔ بہترین انسان وہ نہیں رہا جو کائناتی قوتوں اور خود اپنی "پچھلی تاریخ" کے خلاف مزاحمت کرتا اور کائنات وحیات کے دھاروں کو موڑتا یا موڑنے کی کوشش کرتا بلکہ بہترین اور کامل ترین انسان وہ قرار پایا، جو اس دنیا سے دور، اس دنیا کے رنج والم سے دور، انسان کے درد دکھ سے دور، بدی اور گناہ سے جسمانی طور پر پناہ مانگتا ہوا طرف "مراقبہ" کی زندگی گزارتا رہا۔ اگر کسی مذہب نے انسانوں سے، اس بہترین انسان کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی تو، وہ بہترین انسان "ایک راہب بھکشو" کی صورت میں نمودار ہوا۔ جو عام انسانوں سے محبت تو کرتا ہے لیکن اس محبت میں ہمدردی سے زیادہ "رحم" کارفرما ہے۔ اور یہ اعلیٰ انسان یہ "راہب بھکشو" بہرحال انسانی روحوں کے سمندر میں ایک نجات یافتہ جزیرہ ہے، جس کا اس سمندر سے صرف اتنا تعلق ہے کہ اس سمندر کی موجیں اس کی شخصیت کے ساحل سے تھپیڑے کھاتی ہیں۔ لیکن اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ انسان کے متعلق، ان تمام تصورات کے برخلاف قرآن نے یہ انقلاب آفرین تصور پیش کیا کہ وہ "حاملِ بارِ امانت" ہے۔

قرآن کی یہ آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (سورۂ احزاب آیت ۷۲) قرآن کی انتہائی انقلاب آفرین آیتوں میں ایک ہے۔ جس نے نظریاتی طور پر بلکہ تاریخی حیثیت سے انسانی شعور کو نئے امکانات اور نئے حوصلوں سے روشناس کروایا۔ وہ عمل، جس کو پچھلے مذہبی شعور نے محض نافرمانی اور سرکشی سے تعبیر کیا تھا۔ قرآن نے اس عمل کو ایک نیا اور اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ پچھلا مذہبی شعور منفی یا NEGATIVE تھا۔ اور اسی لئے اس عمل میں صرف نافرمانی اور سرکشی نظر آئی۔ قرآن مجید کائنات اور انسانی زندگی کے بارے میں ایک مثبت نقطۂ نظر فراہم کرتا ہے۔ اور اسی لئے انسان کا پہلا عمل محض نافرمانی اور سرکشی نہیں ہے، بلکہ اس کے امکانی ارادہ اور خدا کے عطا کئے ہوئے اختیار کا پہلا حوصلہ مندانہ اور ایک حد تک مہم پسندانہ (ADVENTUROUS) اظہار ہے۔ گویا یہ جبر کے دائرہ سے اختیار کی مملکت میں انسان کی پہلی جست تھی۔ اختیار کے اس

عمل سے انسان کا اس کے پہلے دور سے ربط ٹوٹ گیا۔ معصومیت ذمہ داری میں بدل گئی۔ اس ابتدائی اختیار (ORIGINAL-CHOICE) نے امکانی لامحدود آزادی کو "محدود آزادی" میں بدل دیا کیونکہ اختیار کا استعمال ہی "لامحدود تصوری آزادی" کو محدود آزادی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ارادہ کا یہی استعمال کہ اس "امانت" کو جس کے قبول کرنے سے آسمان اور زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا، اس نے اٹھا لیا انسانی زندگی کے "ازلی اور ابدی حزنیے" کا سبب بنا۔ ایک طرف تو یہ بلند ارادہ اور حوصلہ ۔ اور دوسری طرف اس کا فانی اور زمانی و مکانی، دونوں حیثیتوں سے اس کا محدود وجود، ارادوں اور تمناؤں کا "زمان مکان" میں محدود دنیا (SPACE-TIME BOUND WORLD) سے لازمی اور ناگزیر تصادم اور تمناؤں اور ارادوں کا زمان و مکان کی چٹانوں سے شکست کھا کر ٹوٹ جانا، عرفانِ رب کا اور ایک لامحدود محیط کل قدیر اور علیم وجود کے اعتراف کا ایک اہم نفسیاتی ماخذ ہے۔ اسی اہم "تجربے" کو حضرت علی رضؓ نے اپنے اس عارفانہ جملے میں اظہار فرمایا کہ عَرَفْتُ رَبِّیْ مِنْ فَسْخِ الْعَزَائِمِ۔ ایک حیثیت سے یہ عرفانِ رب جو شکستِ عزائم سے اور ارادوں اور تمناؤں کی واقعی دنیا سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ اعلیٰ ترین "عرفان" ہے کیوں کہ یہ ایک ایسے انسان کا عرفان ہے جس نے اپنے بنیادی ارادے اور اختیار کے استعمال، اس کے اثبات اور اپنی چھپی ہوئی اعلیٰ ترقوتوں کے اظہار کے سلسلہ میں حاصل کیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک "راہب" کا عرفان نہیں ہے، جس نے خدا کی عطا کی ہوئی قدرت، یعنے ارادے کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جس نے عزائم، ارادوں اور تمناؤں کو "عرفانِ رب" کا ایک ذریعہ اور وسیلہ تصور کرنے کے بجائے انھیں آخری نجات کیلئے ایک رکاوٹ تصور کیا۔ شکستِ عزائم کے اس لمحہ جب انسان "اپنی محدودیت" کا اعتراف کرتا اور اپنے ارادہ کو "لامحدود ربانی ارادے" کے سپرد کر دیتا ہے، تو اس پر عرفانِ رب کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور جب وہ اس کے برخلاف یاس و قنوط کا شکار ہو جاتا، اس کائنات کو ایک "بے مقصد" وجود تصور کرنے لگتا ہے اور اپنے دامن سے اپنے گناہوں کے دھبے دھونے کے لئے اس کائنات سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ تو گویا، وہ خدا کی رحمت اور اس کی لامحدود قدرت کا بالواسطہ انکار کرتا ہے اسی لئے قرآن نے حزن اور قنوط کو "مومن" کے لئے حرام ٹھیرایا۔ لَا تَحْزَنُوْا

وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (سورہ آل عمران آیت ۱۳۹)
یا پھر" اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" (سورہ یونس آیت ۶۲)
میں اسی اہم حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ انسان اپنی اس سپردگی اور اعتراف شکست سے اپنی محدود قدرت
کے اعتراف اور ایک لامحدود وجود سے "جو علیم بھی اور قدیر بھی اور جو ارادہ کا سرچشمہ ہے" اپنا رشتہ جوڑ
لینے سے ایک نئی طاقت اور ایک نیا حوصلہ حاصل کرتا ہے اور پھر "کارزارِ حیات" میں پہلے سے کہیں
زیادہ عزائم و ارادے کے ساتھ واپس آتا ہے مشہور مورخ فلسفی TOYNBEE نے اس عمل کو
(WITH-DRAWLE.RETURN) یا "عزلت اور مراجعت" کی اصطلاحوں میں پیش
کیا ہے، جو اس کے نزدیک تخلیقی شخصیتوں کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کے الفاظ میں تخلیقی شخصیتیں
عمل کی دنیا سے روحانی انبساط (ECSTASY) کی دنیا میں اور پھر ایک نئی اور اعلیٰ تر سطح پر روحانی
انبساط اور وجدان کی دنیا سے عمل کی دنیا میں واپس آتی ہیں۔ دعا (PRAYER)، عزلت
(WITH-DRAWL) کی ایک اعلیٰ ترین اور روحانی حیثیت سے بلند ترین مثال ہے۔ اس لمحہ جب
انسان اپنی محدودیت کا اعتراف کرتے ہوئے دعا کرتا ہے، تو وہ صرف اپنی شکست کا اظہار نہیں کرتا
بلکہ ایک نئی قوت اور ایک نئے حوصلہ کی تلاش کرتا ہے۔ وہ دعا اس لئے نہیں مانگتا کہ وہ زیادہ حاصل
کرے بلکہ اپنی ذات اور اپنے وجود کو اور زیادہ مالا مال کرے۔ مشہور ہمعصر فلسفی مصنف MARCIL
کے الفاظ میں "NOT TO GAIN MORE, BUT TOBE MORE." غالب کے الفاظ میں
بہترین دعا وہ ہے جو "بغیر یک دلِ بے مدعا" مانگی جائے۔ یہ تضاد نہیں ہے بلکہ "اعلیٰ تر روحانی
تجربہ کا امکان" ہے۔

قرآن مجید میں اکثر دعائیں، جو انبیاء علیہم السلام نے اپنی عملی زندگی کے دوران میں اور خلق اللہ
کو ہدایت پہونچانے کے ضمن میں مانگیں، TOYNBEE کے الفاظ میں "عمل کی دنیا" سے "عزلت"
(WITH-DRAWL) کی مثالیں ہیں۔ یہ دعائیں، ان انسانوں کی دعائیں نہیں ہیں جنہوں نے
عمل کی دنیا سے منہ موڑ لیا۔ مگر ان انسانوں کی دعائیں ہیں، جو اپنی ذمہ داری کی تکمیل کیلئے اپنی محدود

طاقتوں کو کافی تصور نہیں کرکے اور ارادے اور قوت کے سرچشمے سے مزید حوصلے، مزید ارادے اور نئی طاقت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ وہ اس کائنات میں اپنے مشن سے واقف ہیں اور ساتھ ہی اپنی کوتاہیوں کے معترف۔ اسی لئے ان کی ایک دعا یہ ہے کہ "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" (سورہ بقر آیت ۲۰۱) وہ جو زیادہ چاہتے ہیں، (TO GAIN MORE) ان کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے "فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ"۔ (سورہ بقر آیت ۲۰۰) ایسے لوگ زیادہ حاصل تو کر لیتے ہیں، لیکن ان کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ وہ اپنی شخصیت کے صرف ایک جزو کی تکمیل کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اس بلیغ دعا میں قرآن کے تصوری انسان کا بہترین اظہار ہے۔ وہ جو دنیا اور آخرت، دونوں کی اچھائیوں اور خوبیوں کا طلبگار ہے اس کے نزدیک دنیا کی خوبیوں اور اچھائیوں سے انکار کا نتیجہ نہیں اور نہ دنیا اور آخرت، دو متضاد عوالم ہیں بلکہ صحیح معنے میں (CONTINUANCE) خدا کی مملکت (THE KINGDOM OF GOD) صرف ان مسکینوں اور کمزوروں کے لئے نہیں ہے جنھوں نے نجات کے لئے دنیا اور اس کی نعمتوں کا انکار کیا اور انھیں اپنے لئے حرام کر لیا۔ بلکہ اس مملکت میں وہ تمام مخلوق جگہ پا سکتی ہے جس نے "حدود" میں رہکر دنیا کا اقرار کیا اور اپنی "بنیادی عبدیت"۔ (CREATURLINESS) کا اقرار کرتے ہوئے اپنے اختیار اور ارادے کو استعمال کیا۔ قرآن مجید کی تمام دعائیں، تلاش اور جستجو کرنے والے انسانوں کی دعائیں ہیں، جو اس کائنات میں اپنا رشتہ تمام دوسری قوتوں سے توڑ کر رب العالمین سے جوڑ لیتے ہیں اور اسی طرح پھر کائنات سے اپنا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ خدا، جس سے انھوں نے اپنا رشتہ جوڑا ہے، "رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" ہے۔ اسی بلیغ حقیقت کی جانب اس آیت میں اشارہ ہے۔ جو حضرت ابراہیمؑ کا ارشاد ہے۔ "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" (سورہ انعام آیت ۱۶۳) گویا صرف اللہ کے لئے نہیں، بلکہ اس اللہ کے لئے جو "رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" ہے۔

اس آیت میں، جس میں انسان کے "امانت" کے قبول کرنے کا ذکر کیا گیا تھا۔ آخر میں یہ کہا گیا کہ "اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" اپنی محدود طاقتوں کا غلط اندازہ انسان کی جہالت

اور اس کی ظلم آفرینی کا بنیادی سبب ہے۔ نمرود، سیزر اور کالیگولا (CALIGULA) اسی انتہائی خود پرستی کا مبالغہ آمیز اظہار تھے۔ انہوں نے اپنی آزادی اور اپنے ارادہ کو اس مہمل حصہ (ABSORLIM)[IT] تک پہونچا دیا۔ ان کی آزادی دوسرے انسانوں کی غلامی میں بدل گئی۔ انسانوں کی آزادی، قرآنی نقطہ نظر سے، اسی وقت برقرار رہ سکتی ہے جب انسان اپنے وجود کی محدودیت (FIXITUDE) سے باخبر ہو، خدائی آزادی (DIVINE FREEDOM) اور انسانی آزادی میں بھی اہم فرق ہے لیکن انسان اپنی اس محدود آزادی اور محدود ارادے پر قانع نہیں ہو سکتا۔ "کمال اور لامحدودیت کی تمنا" اس کے وجود کا ایک لازمی جزو ہے اور دعا کے لطیف ترین "لمحات" میں وہ اس "لامحدود" سے "قربت" محسوس کرتا ہے اور اپنے نقص اور اپنی محدودیت کے عاجزانہ اظہار سے ایک نئی "آزادی اور نیا" "اختیار" حاصل کرتا ہے۔ اس دعا میں انسان اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے ایک نئی "طاقت" حاصل کرنے کی تمنا کرتا ہے۔ "رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا قف وَاغْفِرْ لَنَا قف وَارْحَمْنَا قف اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔" (سورہ بقرہ آیت ۲۸۶) انسانی طاقت کی حد کیا ہے اور کس قدر بوجھ انسان اٹھا سکتا ہے۔ اس کا کوئی خارجی معیار نہیں ہے۔ انسانی طاقت بے حد و اندازہ ہو سکتی ہے۔ اگر انسان طاقت اور قدرت کے سرچشمہ سے اپنا رشتہ جوڑ لے اسی صورت میں انسان کی لامکانی طاقت خود اس کیلئے اور دوسرے انسانوں کیلئے رحمت کا باعث بن سکتی ہے۔

ایک بڑے سائنٹسٹ کے الفاظ میں، "یہ بات آسان نہیں کہ سائنٹیفک تکبر کو مذہبی انکسار کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ لیکن بہترین چیزیں عام طور پر مشکل ہوتی ہیں۔"

"IT IS DIFFICULT TO COMBINE SCIENTIFIC PRIDE WITH RELIGIOUS HUMILITY BUT THE BEST THINGS OFTEN VERY DIFFICULT."

سائنس کی بے پناہ طاقتوں سے حاصل ہونے والی خود شناسی، اسی وقت متکبر کا روپ اختیار کر لیتی ہے جب انسان بالآخر اپنے وجود کی محدودیت سے آگاہ نہ ہو۔ بیشتر قرآنی دعائیں اسی "انکسار" کی تربیت کرتی ہیں جو انسانی طاقت کا انکار نہیں ہے۔ بلکہ جو عظیم تر وجود کی ذمہ داری کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو خدا کا نہ صرف اقرار کرتے ہیں بلکہ ہر دم اس لامحدود وجود سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بالآخر اس کائنات کے حسن اور اس کے جمال سے سرشار ہو جاتے ہیں اور خدا کا یہ ذکر انھیں کائنات میں ان کے مشن سے انھیں آگاہ کرتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (سورہ آل عمران آیت ۱۹۱) اسی لئے اعلیٰ ترین روحانی تجربہ ایک لازوال فضیلت اور لامحدود ارادہ کا ایک حرکی تصور اور عرفان ہے۔ جو ہمیں ایک ایسی تخلیقی قوت کے قریب تر کر دیتا ہے، جس کی کوئی حد نہیں۔

قرآنی دعائیں، اسی لازوال تخلیقی قوت سے انسان کو قریب تر کرتی ہیں اور ایسے ہی ایک لمحہ ایک عرفان حاصل کئے ہوئے انسان کی زبان سے، یہ دعا جاری ہو جاتی ہے۔ "رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" (سورہ تحریم آیت ۸) قرآنی دعاؤں کی ایک دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ دعائیں کسی بالخصوص نعمت اور کسی خاص دولت کیلئے نہیں ہیں، بلکہ ان کا مقصد، ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص مزاج اور ایک خاص ذہنیت کا پیدا کرنا ہے۔ یہ ذہنیت کیا ہے؟ انسان کا اپنا عبدیت کے اقرار کے ساتھ ہی، اس کائنات میں، اس کے اعلیٰ و ارفع مقام کا شکر گذارانہ اظہار، دوسری تمام قوتوں کا انکار اور نتیجتاً اپنی عظمت کا ادراک، اپنی ذمہ داری کا احساس اور اسی لئے مسلسل کے امکان کا شعور اور یہ تمنا کہ اسے ہمیشہ صحیح راستہ کی ہدایت عطا ہو۔ یہ صحیح راستہ جس کے لئے خدا کے حضور دست دعا دراز کرتا ہے، وہی ہے جس پر تمام دنیا کے اور ہر دور کے مذہبی رہنماؤں اور تمام پیغمبروں نے اس کی دعوت دی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں "گویا جس بات کا طلبگار ہے وہ بھی نوع انسانی کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے۔ وہ بھی نوع انسانی کی عالمگیر برائی ہے۔

نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی"۔ اور انہیں کے الفاظ میں "جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچہ میں ڈھل کر نکلے گا، ایک تو یہ کہ اس کی خدا پرستی، خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی، دوسرے یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل، قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا بلکہ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا۔"

اور دعوت قرآنی کی اصلی روح یہی ہے

مسلکِ عشق

بزرگانِ ملّت اور سامعین کرام. وقت کافی ہو چکا ہے. اور ابھی ایک معزز مقرّر کو تقریر کرنی ہے اور نہ تمہید کا وقت ہے اور نہ تشریح کی گنجائش، میں اس موضوع پر مختصراً اپنے خیالات آپکی خدمت میں پیش کروں گا. اور اگر تشنگی کا احساس ہو تو شکایت میری نہ کیجئے بلکہ وقت کی شکایت کیجئے۔

اگر آپ مذاہب کا مطالعہ فرمائیں اور خاص طور پر مذاہب کے ارتقاء کا تو ایک دلچسپ سوال آپکے سامنے آتا ہے کہ کیا انبیاء علیہ السلام اور امامناؑ کوئی ایسی بات آپکے سامنے پیش کرتے ہیں جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ وہ نئی تھی اور اس میں کوئی ندرت تھی. اگر آپ کچھ SHOCK نہ ہو جائیں اور اس پر غور فرمائیں تو آپ اتفاق کرینگے کہ جب بھی کسی پیغمبر نے اپنے پیغام کو پیش کیا ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہی مثلاً جب رسول اللہؐ نے توحید کا پیغام پیش کیا اور توحید کی دعوت دی تو بات نئی نہیں تھی۔ تمام مذاہب میں کسی نہ کسی طرح توحید کا پیغام موجود تھا۔ آپ پہلے انسان نہیں تھے جنھوں نے خدا کے ایک ہونے کی شہادت دی اور خدا کے ایک ہونے کی دعوت انسانوں کو دی. اس سے پہلے مختلف انبیاءؑ نے یہی دعوت دی تھی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ندرت نہیں ہے اور اگر نئی بات نہیں کی جا رہی ہے تو کونسی بڑی بات ہوئی. لیکن اگر ہم دوسرے انداز سے غور کریں تو پھر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ندرت نہیں جس کی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک نیا دین آیا، ایک نیا مذہب آیا، ایک نیا پیغام آیا بلکہ اس بنا پر ہم اس پیغام کو نیا پیغام کہتے ہیں اس دین کو نیا دین کہتے ہیں کہ جو بات یا تو ابتک یا تو سینوں میں محفوظ ہوتی تھی، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی تھی یا پھر کم سے کم، زیادہ سے زیادہ معیار کے طور پر پیش کی جاتی تھی. اسی بات کو شدت کے ساتھ اس بات کو انتہائی عام طور پر کھلے پیمانے پر اور برملا اس کا اظہار کیا گیا. یہاں تک کہ جن لوگوں کے بارے میں آپکا خیال ہے کہ ان کا مذہب مشرکانہ ہے. اور وہ بت پرست ہیں. اگر آپ ان کے مذہب کی

ؑ جشن میلاد امامنا مہدی موعودؑ کے موقع پر کیگئی ایک تقریر۔

تحقیق فرمائیں تو آپ یہ محسوس کریں گے آپ کو علم ہوگا کہ ان کے پاس بھی توحید کا پیغام تھا۔ چنانچہ یہ بات مشہور ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ ویدانت کے ماننے والے اور جب ان کا گرو اپنے مرید سے بات کرتا ہے تو وہ آہستہ سے سرگوشی کے انداز سے گویا اس بات کو بیان کرتا ہے، بتاتا ہے کہ دیکھو خدا صرف ایک ہے لیکن یہ بات سرگوشی کے انداز میں کہی جاتی ہے۔ یہ بات برملا نہیں کہی جاتی۔ یہ اعلیٰ ترین معیار ہوتا ہے مذہب کا یہ اعلیٰ ترین معیار ہوتا ہے۔ ندرت کا تقویٰ کا، اور یہ اعلیٰ ترین معیار ہوتا ہے دین کا لیکن اس اعلیٰ ترین معیار پر عام لوگوں کو پہونچنے کی اور اس اعلیٰ ترین معیار تک عام لوگوں کو آنے کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن پیغمبر نے اور خاص طور پر پیغمبر اسلام نے اسی پیغام توحید کو جو ابتک برملا نہیں کہا جاتا تھا۔ یا اگر برملا کہا جاتا تھا تو اس میں شدت نہیں تھی آپ نے اسی کو شدت کے ساتھ پیش کیا۔ اب گویا اسلام اثبات کا نام ہوا کہ جو بات ابتک اعلیٰ ترین معیار کی تھی اور جو بات ابتک سرگوشیوں میں کہی جاتی تھی اب اس کو عام طور پر کہا جائیگا۔ اب وہ دین کا کمترین معیار ہوگا۔ اعلیٰ ترین معیار نہیں ہوگا اس سے کم معیار پر دین قائم نہیں ہوگا۔ جو بات کسی مذہب کے ایک SAINT نے کہی تھی وہی بات کسی مذہب کے بڑے بزرگ نے اپنے مرید سے سرگوشی کے انداز میں کہی تھی۔ اب اس کو برملا کہنا ہوگا۔ اور جبتک یہ بات برملا نہیں کہی جائیگی جب تک اس بات کو کم سے کم حد نہیں سمجھا جائیگا اس وقت تک دین مکمل نہیں ہوگا۔ اس وقت تک دین کے معیار پر آپ پورے نہیں اتریں گے۔ اس لئے جب آپ اس بات کو محسوس کریں اور اس بات پر غور کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ کسی پیغمبر نے کوئی بات ندرت کی نہیں کی۔ بلکہ پیغمبر نے اسی بات کو جو کہی جاتی تھی جو عام مذہبی شعور میں موجود تھی جو ذہنوں میں مضطرب تھی اسی بات کو شدت کے ساتھ پیش کیا اور اس شدت کیساتھ پیش کیا کہ وہ بات انسانوں کے مذہبی شعور کا ایک عام جزین کر رہ گئی۔

اب اس کے بعد اس بات سے پیچھے جانا کچھ بات کی گنجائش نہیں رہی کہ آپ اگلے stages پر آپ اسے پہلے جو منازل تھے اس سے پہلے کے جو مراحل تھے اس پر آپ پہونچیں۔ توحید کے پیغام کے بعد خدا کے ایک ہونے کے پیغام کے بعد اب اس بات کی گنجائش نہیں رہی۔ مذہبی شعور میں خود اس بات کی گنجائش نہیں رہی کہ ہم خدا کے ایک ہونے کے بجائے ہم خداؤں کی تالی پیش کریں۔ خداؤں کے نظریہ کو ہم قبول کریں

یا خداؤں کے نظریہ کو ہم پیش کریں۔ اب اس کے بعد آپ اس بات کو محسوس کرینگے۔ اگر آپ نے مذاہب کا مطالعہ کیا ہے تو وہ مذاہب بھی جہاں توحید یا خدا کے ایک ہونے کی تعلیم یا تو موجود تھی۔ لیکن جیسے میں نے کہا صرف اعلیٰ تر معیار پر موجود تھی یا رسوم اور عادات، اور جہاں تک اعمال تھے اس میں احتیاط اگر ملحوظ نہیں بھی تھی تو آپ یہ بات محسوس کرینگے کہ ان تمام مذاہب کی یہ کوشش ہوگی کہ تاویل، تشریح اور تعبیر کے ذریعہ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ ان کے مذہب میں بھی توحید کی تعلیم موجود ہے۔ اور وہ بھی توحید کے ماننے والے ہیں۔ تو گویا مذہبی شعور جب ایک خاص منزل پر پہونچتا ہے تو اس وقت ایک پیغمبر اس خاص بات کو جو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو چلی تھی اس کو شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ تو گویا ایک لحاظ سے جو خدائی ہدایت جو ہوتی ہے وہ قبل اس کے کہ وہ پیش کر دی جائے لفظ کے ذریعہ وہ پیش کر دی جائے۔ پیغام کے ذریعہ، وہ غیر شعوری طور پر، رفتہ رفتہ تدریجی طور پر انسانوں کے ذہن میں اپنی جگہ کرنے لگتی ہے، انسانوں کے ذہن میں وہ پیدا ہونے لگتی ہے، پھر اس کے بعد اس پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے اور شدت کے ساتھ بیان کی جاتی ہے، اسی بات کو آپ دیکھیں گے اسلام کی تاریخ میں تو آپ ایک خاص بات محسوس کرینگے کہ اسی لمحہ اسی دور میں جب شریعت مکمل ہوئی جب اس بات کو ہم کہتے ہیں کہ قانون الٰہی مدون ہوا جس بات کو ہم کہتے ہیں کہ اعمال کے تمام معیار مقرر ہوئے اور لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ عبادت کس طرح کی جائے۔ شرائط کن چیزوں کا نام ہے۔ شعائر کیا ہیں۔ شریعت کیا بیان کرتی ہے۔ ایک نئی تحریک ایک نئی موج اٹھی اور وہ موج بڑی دلچسپ تھی جس نے نہ صرف یہ کہ تاریخ اسلام میں بڑی حد تک یہ بات زلزلہ فگن تھی یہ بات نئی تھی۔ اور اس نے تاریخ اسلام کی ایک لحاظ سے اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے نئی بنیادیں قائم کیں اور لوگوں کے ذہنوں میں ایک نئے قسم کے سوال کو پیدا کیا ایک نئے معیار کو پیدا کیا۔ ایک سوال جو اس زمانہ میں اٹھا وہ یہ کہ کیا انسان کی پوری عبادت کا مقصود یہی ہے۔ کیا انسان کے مذہبی شعور کا پورا معیار یہی ہے کہ وہ چند شعائر کی پابندی کرے۔ کیا مذہب کا مفہوم یہی ہے کہ چند باتوں پر عمل کیا جائے۔ چند طریقوں سے عبادتیں ادا کی جائیں ایک شریعت پر عمل کیا جائے ایک قانون پر عمل کیا جائے۔ پھر یہ سوال انسان کے ذہن میں لازمی طور پر پیدا ہوا کہ کیا صرف خدائی پیغام کا مقصد یہی تھا۔ کیا یہی ہو سکتا ہے کہ ہم کو ایک قانون عطا کیا جائے۔ ایک

قانون جو ہمارے سماج کا بھی قانون ہے. ایک قانون جو ہماری معاش کا بھی قانون ہے۔ ایک قانون جو ہمارے معاملات کا بھی قانون ہے. کیا خدائی ہدایات کا منشاء صرف یہی ہو سکتا ہے. اور کیا خدائی ہدایات کا مقصود و منتہا یہی ہو سکتا ہے کہ انسانوں کو ایک قانون دیدیا جائے جب کہ ہم انسانی تاریخ میں اسبات کو بھی دیکھتے ہیں. جبکہ ہم اسبات کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ لوگ بھی جنھیں خدائی قانون نہیں ملتا ہے یا وہ لوگ بھی جن تک خدائی قانون نہیں پہونچا وہ بھی خیر کے وہ بھی جمال کے اور وہ بھی اچھائی کے کم از کم کمتر معیارات کے حامل رہے ہیں ہم اسبات کا کبھی بھی نہ اعلان کر سکتے ہیں اور نہ اس بات پر کبھی بھی ہم فخر کر سکتے ہیں کہ تمام وہ نیکیاں جن کو ہم نیکیاں کہتے ہیں۔ اخلاقی فضائل کہتے ہیں ان کے وارث ہم ہی رہے ہیں. تاریخ میں یہ بات آپ کو عام طور پر ملے گی۔

اگر آج بھی آپ آنکھ کھولکر دیکھیں اپنے گرد و پیش میں تو اس بات کو محسوس کریں گے کہ وہاں بھی آپ کو اخلاقی فضائل ملیں گے. جہاں خدا موجود نہیں ہے. کئی بے خدا بھی آپ کو ایسے ملیں گے جن کے اخلاقی فضائل کا جہاں تک تعلق ہے شائد ان کے اخلاقی فضائل ہم سے اور آپ سے بہتر ہوں. آپ بہت سے بے خدا لوگوں کو ایسے پائیں گے جن کے دل میں انسان کی محبت ایک انسان سے ہمدردی اور جن کے دل میں انسان کا درد اُن سے زیادہ ہے جو خدا کی پرستش کرتے ہیں. جو خدائی شریعت پر مکمل طور پر عمل پیرا ہیں اور جو یہ بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا عمل شریعت خداوندی سے سرِ مو متجاوز نہیں ہوتا یا اس سے انحراف نہیں کرتا۔ اس بات میں فخر کی کوئی گنجائش نہیں ہے. اگر ہمارا مطالعہ ٹھیک ہے۔ اگر ہمارا مشاہدہ ٹھیک ہے تو اس بات پر فخر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ صرف وہی لوگ اخلاق کی نیکیوں کے حامل ہیں صرف وہی لوگ اخلاق کے فضائل کے حامل ہیں جو خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں، جو خدا کو مانتے ہیں یا جو کسی ایک خدائی شریعت کے حامل ہیں اور اس پر عمل پیرا ہیں یہ بات ہمارے مشاہدہ کے خلاف ہے تو پھر ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوا. تاریخ اسلام میں پہلی صدی ہجری میں اور دوسری صدی ہجری ہی میں کہ مقصود دین کیا ہے۔ وہ کیا مقصد تھا جس کے لئے پیغمبر آئے تھے. پھر یہی سوال پیدا ہوا اور اس سوال نے کئی حساس ذہنوں کو متاثر کیا۔ کئی حساس ذہنوں کو مضطرب کیا کہ کیا مقصد ہے اس بات کا کیا مطالبہ ہے، اسبات کا

کہ ہمیں پیغمبروں کے راستہ پر چلنا چاہیئے؟ کیا پیغمبروں کے راستہ پر چلنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہم اُسی قسم کا لباس پہنیں جو پیغمبر پہنتے تھے، ہم اسی طرح کی اپنی زندگی گزاریں ظاہری اعمال ظاہری رسوم جس طرح پیغمبر گزارا کرتے تھے ظاہر ہے کہ اگر ایک دوسرا سوال پیش نظر ہو اگر معیار فرض کیجیے کہ عشق رسول ہو تو یقیناً اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ ایک عاشق رسول وہی کرنا پسند کرے گا جو رسول کرتے تھے چنانچہ ایک مشہور صوفی شاعر ابوسعید ابوالخیر کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے منہ میں دانت باقی نہیں تھے لیکن وہ مسواک کیا کرتے تھے جب ان سے پوچھا گیا تو اُن کا جواب یہی تھا کہ رسول اللہ یہی کیا کرتے تھے لیکن یہ منزل عشق کی نہیں ہے لیکن اگر دوسری طرح اس کو سوچیں تو کیا مذہب کا مقصود صرف یہی ہوگا. کیا سنت نبوی پر عمل کرنے کے معنے و مفہوم یہی ہوں گے کہ ہم ظاہری جہاں تک اعمال ہیں اپنے آپ کو اس بات کا پابند کرلیں کہ وہی کریں جو رسول اللہ کرتے تھے اسی طرح کریں جیسے رسول اللہ کرتے تھے لیکن فرض کرلیجیے کہ ہم نے سب کچھ وہ کرلیا لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہی سوال تھا جو دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوا کہ اگر ہمارے اعمال وہی ہوں جو رسول اللہ کے اعمال تھے اگر ہمارا طرز بھی وہی ہو جو رسول اللہ کا طرز تھا. ظاہری طرز تھا. لیکن اگر دل اس آگ سے خالی ہو جو رسول اللہ کے دل میں منوّر تھی. اگر ہمارے دل میں وہ نور موجود نہ ہو جو رسول اللہ کے دل میں موجود تھا تو کیا ظاہری اعمال پر انحصار کیا ظاہری اعمال کی تخلیق کا ایک پورا فخر اور اس پر پورا زور کیا ہمارے دین کو مکمل کردیگا یہ منزل جسے میں نے آپ سے کہا تاریخ اسلام کی بہت ہی مشکل منزل تھی. اور تاریخ انسانیت کی ایک بہت ہی اہم منزل تھی. اور اسی منزل کو ہم کہتے ہیں اسلام میں اس تحریک کا آغاز جس کو ہم تصوف کی تحریک یا صوفیہ کی تحریک کا ہم نام دیتے ہیں. اب اس پوری تحریک کا جو نشانہ تھا. اس پوری تحریک کا جو مفہوم تھا، جو منتہا تھا وہ یہ تھا کہ انسان اپنے دلوں کو اس آگ سے منور کرنے کی کوشش کرے جو رسولِ مقبول کے قلب میں موجود تھی. اور اس اضطراب کو پیدا کرنے کی کوشش کرے جو رسول مقبول کے قلب میں موجزن تھا. اور اپنی زندگی کا اپنے دین کا مقصد اُس لمحہ کو بنائے جو رسول اللہ کی زندگی کا اعلیٰ ترین لمحہ تھا. وہ لمحہ جب رسول اللہ کے سامنے سے وہ تمام پردے ہٹے وہ تمام ظاہری پردے ہٹے جو خالق کو مخلوق سے جدا کرتے ہیں. اور وہ پردے ہٹے جن پردوں کی موجودگی میں خدا صرف ایک عقیدہ رہتا ہے. خدا ایک مفروضہ رہتا ہے. خدا ایک

اصول رہتا ہے لیکن خدا ایک زندہ حقیقت نہیں بنتا۔ اگر انسان اپنی اخلاقی، اپنی مذہبی زندگی کا منتہا اور مقصود رسول اللہ کے اس لمحہ کو بنانے کی کوشش نہ کرے تو پھر اس کا مذہب چند اصولوں کا چند مسلمات کا چند PRINCIPLES کا نام ہو کر رہ جاتا ہے لیکن وہ اصول لیکن وہ دعاوی اس کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کرتے جو انقلاب کہ رسولِ مقبول کی زندگی میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہ انقلاب جو رسول مقبول نے اپنی زندگی میں اپنے ہمعصروں کی زندگی میں پیدا کیا۔ اور وہ انقلاب جو رسول مقبول نے تاریخ میں پیدا کیا تو اسی لئے سنت کا ایک مفہوم تو یہ ہوگا کہ جب ہمارے قدم اس زمین پر متحرک ہوں جب ہمارے قدم تاریخ میں متحرک ہوں تو اس وقت قدم تو زمین پر رہیں لیکن نظریں ماوریٰ پر رہیں۔ ایک مفہوم سنت کا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر سنت کا دوسرا مفہوم اگر ہم لے لیں۔ جب کہ قدم بھی زمین پر ہوں نظریں بھی زمین پر ہوں۔ لیکن ظاہری اعمال ہمارے وہی ہوں جو رسولِ مقبول کے تھے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا انسان کسی دوسرے قانون کی پابندی کرتے ہوئے کسی دوسرے قانون کی اتباع کرتے ہوئے اخلاقی فضائل پیدا نہیں کر سکتا؟ تو پھر صورتِ حال یہ ہے کہ اگر دین کے منتہا تک پہونچنا ہے، اگر دین کے مقصود کو پہونچنا ہے اگر اس پیغام کی روح کو اگر ہمیں اخذ کرنا ہے۔ اگر ہمیں اسکو حاصل کرنا ہے۔ تو پھر رسولِ مقبول کی زندگی کے اس اعلیٰ ترین لمحہ کو اپنا مدعا اور مقصود بنانا ہوگا جس لمحہ ان پر حقیقت مطلق پوری طرح منکشف ہوئی۔ اب یہ جو اعلیٰ ترین معیار تھا۔ یہ جو اعلیٰ ترین لمحہ تھا رسول مقبول کی زندگی کا وہ مسلمان صوفیہ اور مسلمان اولیاء کے پاس ان کی زندگی کے لئے اعلیٰ ترین لمحہ بن گیا۔ اور پھر اس حقیقت تک پہونچنے کے لئے ایک چیز صاف ظاہر ہوئی کہ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ دل خدا کے خوف سے ہمارے بھرے ہوئے ہوں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے دل میں عشق کی آگ بھی زندہ ہو جائے۔ اگر مقصد فہم ہے تو پھر عقل ہماری رہنما بنتی ہے منطق ہماری رہنما بنتی ہے اور استدلال ہمارا رہنما بنتا ہے لیکن اگر مقصد دید ہو تو پھر ہمارا رہنما تو پھر ہمارا استاد تو پھر ہمارا امام عشق بن جاتا ہے تو جن لوگوں نے فہم کو اپنا مدعا بنایا جن لوگوں نے فہم کو اپنی منزل بنائی۔ انہوں نے علم کو اپنا امام بنایا لیکن جن لوگوں نے دید کو اپنا مقصد بنایا جن کے لئے دید مقصود بنی۔ انہوں نے عشق کو اپنا امام بنایا۔ اور پھر ایک وہ منزل بھی آئی جب ایک شہید منزل نے یہ بھی کہا (عربی) کہ میں عشق کے راستہ

میں دو رکعتیں پیش کر رہا ہوں اور ان کا وضو صرف میرے خون سے ہو سکیگا۔ یہ تھے منصور حلاج۔ یہ وہ منزل ہے جہاں انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر دید میرا مقصود ہے۔ اگر دید میرا مطلب ہے تو پھر میرے دل میں عشق کی آگ کو روشن ہونا چاہیئے۔

اب یہاں علم اور یہاں عقل آپ کی امام اور آپ کی رہنما نہیں بنتی۔ بلکہ عشق آپ کا رہنما بنتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اگر عام انسانوں کے لئے مطلوب اگر دید نہ ہو اور صرف خواص کیلئے ہو تو پھر خواص ہی کے لئے عشق امام بنے گا۔ لیکن اگر عام انسانوں کا بھی اگر مقصود دید ہو تو پھر عام انسانوں کے لئے بھی امام اور رہنما عشق بنے گا۔ یہی بات امام علیہ السلام نے کہی ہے اور کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ لیکن وہ بات جو فضاء میں عام ہو رہی تھی، جس کو مضطرب دل محسوس کر رہے تھے جس کی طرف لوگ رواں دواں آگے بڑھ رہے تھے، اسی بات کو آپ نے برملا کہا۔ اسی بات کو آپ نے شدت سے کہا اور آپ نے یہ فرمایا کہ یہ چند لوگوں کی منزل نہیں ہے یہ خواص کی منزل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہر شخص کی منزل ہے یہ ہر شخص کا حق ہے اسی لئے ہر شخص کا فرض ہے اگر کوئی چیز ہر شخص کا اگر حق نہیں ہے تو ہر شخص کا فرض نہیں بنے گا لیکن جب دید آپ کا حق بن جائے تو دید آپ کا فرض بھی بنے گا، اور جب دید آپ کا حق ہے تو پھر عشق ہر ایک کا امام بنے گا۔

تو اسی لئے آپ نے فرمایا کہ "قرآن عشق نامہ ہے"۔ اب اسلام کی ایک نئی تعبیر اسلام کا ایک نیا مفہوم۔ اسلام کو ایک نئے معنے حاصل ہوئے۔ آج جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، اسلام ایک قانون ہے اسلام ایک LAW ہے، اسلام ایک دستور ہے وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں اسلام کی دوسری صدی کے بعد ہی لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ اب ہمارے مذہبی شعور کے لئے دستور ضروری ہے۔ لیکن دستور کافی نہیں ہے شریعت ضروری ہے لیکن شریعت کافی نہیں ہے۔ اب ہمیں اس سے آگے بڑھنا ہے اور اگر یہ شعور پیدا نہ ہوتا تو دوسری صدی ہجری سے لیکر آٹھویں اور نویں صدی ہجری تک آپ کو ایسے شہدائے محبت کے نام نظر نہ آتے جنھوں نے خدا کی محبت میں اپنی جانیں قربان کیں اور خدا کے لئے مشقتیں بھی اٹھائیں اور جنھوں نے دنیا کو چھوڑا جنھوں نے دنیا کے اموال کو چھوڑا جنھوں نے دنیا کی مال و دولت کو ترک کیا اور پھر خدا کے راستہ میں چل پڑے اگر صرف شریعت کافی ہوتی

اگر صرف دستور کافی ہوتا تو ظاہری اعمال بھی کافی ہوتے اور ایک خاص طریقہ سماجی زندگی کا ایک معیار بن جاتا۔
لیکن مختصراً میں آج آپ سے یہ عرض کروں گا کہ اب ہم انسانی زندگی کی جس منزل پر ہیں وہاں مذہب کو اگر ہم صرف ایک دستور سمجھیں مذہب کو اگر صرف ایک قانون سمجھیں تو میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کیلئے اور خاص طور پر حساس اور باشعور انسانوں کی اکثریت کیلئے مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیوں کہ یہ بات ممکن ہے آج کے اس دور میں کہ کسی بھی قانون پر عمل کرتے ہوئے آپ اخلاقی فضیلتوں کو حاصل کریں۔ کسی بھی قانون پر عمل کرتے ہوئے آپ انصاف حاصل کریں کسی بھی قانون پر عمل کرتے ہوئے آپ دولت کی مساوی تقسیم کردیں کسی بھی قانون پر عمل کرتے ہوئے آپ سماجی انصاف کریں، آپ بیویوں سے اچھا سلوک کریں اور اولاد سے اچھا سلوک کریں۔ اسبات کا امکان موجود ہے۔ اور انسانی عقل اس منزل پر پہونچ چکی ہے جہاں کہ وہ اپنی سماجی اپنی معاشی زندگی کو منظم کرسکتی ہے۔ اس کی تنظیم کرسکتی ہے۔ اس لئے جہاں میں نے آپ سے عرض کیا کہ شریعت ضروری ہے وہیں شریعت کافی نہیں۔ اور امام علیہ السلام کا سب سے بڑا جو احسان انسانوں پر تھا وہ یہ تھا کہ وہ چیز جو رفتہ رفتہ تجریدی طور پر انسان کے مذہبی شعور کی منزل بن رہی تھی اُس کو آپ نے برملا فرمایا۔ اور اگر آپ اس کے امکانات کا جائزہ لیں تو آپ اسبات کو محسوس کریں گے کہ جس دل میں پھر اس عشق کی آگ روشن ہوگی تو پھر وہ دل اس قسم کا دل بنے گا پھر وہ انسان اس قسم کا انسان بنے گا کہ وہ ساری مخلوق کے لئے ساری کائنات کے لئے وہ رحمت بن سکتا ہے۔ اگر رسول مقبول رحمت العٰلمین تھے تو اس کے ہر امتی کی منزل یہی بنے گی کہ وہ رحمت العٰلمین بنے۔ اسی صفت آپکی نہیں رہے گی بلکہ ہم سب کی منزل بنے گی۔ لیکن وہ منزل کب بنے؟ کب وہ منزل آئے؟ کب وہ وقت آئے جب کہ ہر مسلمان اس بات کی کوشش کرے کہ وہ رحمت العٰلمین بنے۔ وہ ساری دنیا کے لئے ایک رحمت بنے اور اگر وہ اپنے آپ کو اس منزل پر پہونچانے کی کوشش نہیں کرتا۔ تو مطلب اس کا یہ ہوا کہ رسول کی زندگی اس کے لئے معیار نہیں ہے لیکن رحمت العٰلمین بننے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس منزل کو اپنائے جو منزل دید کی منزل ہے۔ جب دید کی منزل آتی ہے تو پھر اس وقت انسان رحمت بنتا ہے۔ جب پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں اسوقت انسان رحمت نہیں بنتا۔ لیکن جب دید کی منزل آتی ہے تو اسی وقت انسان رحمت بنتا ہے۔ اور اس دید

کی منزل تک پہونچنے کیلئے عشق کے مسلک کو اپنانا پڑتا ہے اور یہی وہ عشق کا مسلک ہے جس مسلک کو حاصل کئے بغیر ہم انسانیت کے اس اعلیٰ ترین معیار پر ہم پہونچ نہیں سکتے جہاں پھر انصاف اور عدل کی راہیں کھلتی ہیں۔ ہمیں اس بات کو اس منزل پر یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ کہ وہی عادل بن سکتا ہے جو محسن ہے آپ مقامِ عدل پر رہتے ہوئے عدل نہیں کر سکتے۔ مقام عدل پر اگر آپ رہنے کی کوشش کریں تو آپ عادل نہیں بن سکتے۔ آپ عادل اسی وقت بنیں گے جب آپ مقام احسان پر پہونچنے کی کوشش کریں۔ جو محسن ہے وہی عادل بن سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ مقام عدل پر رکنا چاہیں مقام عدل پر توقف کرنا چاہیں اور اگر اسی مقام کو آپ اگر اپنی منزل بنائیں تو آپ عادل نہیں بنیں گے۔ آپکی منزل اگر دید نہ ہو تو پھر آپ رحمت نہیں بن سکیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ میں دید سے محروم رہوں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دید میری منزل ہے کہ نہیں؟ اگر حقیقت کو دیکھنے کی تمنّا اگر میرے دل میں موجود نہیں ہے تو پھر اس صورت میں میں قانون کی پابندی کر دونگا۔ میں ایک خاص طریقہ پر عمل تو کر دونگا لیکن وہ جو عشق کی اضطراب اور جو آگ تھی رسول کے قلب میں موجزن امام کے قلب میں موجزن تھی میرے دل میں موجزن نہیں ہوگی۔ وہ آگ مجھے مضطرب نہیں کرے گی تو پھر میں اس منزل پر نہیں پہونچونگا جس منزل پر مجھے رسول اور امام بلانا چاہتے تھے۔ اسی لئے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اقبال یہ کہتے ہیں ؎

کہ بجھی آگ اندھیر ہے　　مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان شریعت سے ہٹ چکا ہے آج بھی ایسی ہزاروں مثالیں نظر آئینگی کہ جہاں مسجدیں آباد ہیں آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ ہر سال حاجیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے ہر سال حاجیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لیکن پھر بھی اقبال کا شکوہ بجا ہے کہ "مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔" "بجھی آگ اندھیر ہے۔" میں صرف اس بات کو کہہ کر تقریر ختم کر دوں گا کہ اس ہستی نے جس نے دید کو آپ کی منزل بنایا۔ انہوں نے یہی بات کہی کہ اگر عشق موجود نہ ہو۔ اگر دید کی تڑپ موجود نہ ہو تو پھر حج سے فائدہ کیا حج کو وہی جائے جس کے دل میں دید کی تمنا موجود ہو دید کی تمنا اگر موجود نہ ہو دید کا اضطراب اگر موجود نہ ہو عشق اگر امام نہ ہو تو پھر اس وقت شریعت محض رسم ہو کر رہ جاتی ہے جو مقصد کی تکمیل نہیں کر سکتی اور پھر ایسے میں اس سے قریب ہوئے بغیر اسلام کی تکمیل نہیں ہو سکتی اگر اس منشا کی ہمکو تکمیل کرنی ہے اگر خدائے حیّ و قیوم سے ہمکو قریب ہونا ہے تو پھر عشق کی آگ کو اپنے دلوں میں روشن کرنا ہوگا۔ اور دید کو اپنی منزل بنانا ہوگا۔

●● ————

سفر آغاز اور منزل

صوفیانہ ادب کا مطالعہ میرے ادبی مشغلے میں خاصا اہم ہے۔ اس دلچسپی کے وجوہ ادبی بھی ہیں اور فکری بھی۔ اس ادب اور صوفیانہ شاعری میں انسانی وجود و ہستی کا عجیب و غریب ادراک حاصل ہوتا ہے۔ اس پورے ادب کو "کنز مخفی" کے رمز نے بیدار کیا ہے۔ اور اسی سبب سے اس ادب نے ان رموز و علائم کو پیدا کیا ہے جن کی بے شمار تعبیریں ممکن ہیں۔ کوئی ایک تعبیر تو ایسی ہو جس کو قطعی اور آخری کہا جائے۔ الیقین نہ آئے تو پھر سے دیوانِ حافظ کے صفحات الٹئے۔ یہاں مدعا تعبیر نہیں ہے، صرف ایک اشارہ مقصود ہے۔ صوفیانہ ادب کسی نہ کسی صورت میں دسویں صدی ہجری سے آج تک مروج ہے اور مقبول بھی، لیکن ایک اہم فرق، اگلے اور پچھلے ادب میں دو دنیاؤں کے فرق کو نمایاں کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم دو الگ دنیاؤں کی سیر کر رہے ہیں۔ اگلے ادب کی دنیا میں ایک انبساط ہے، مستی ہے، بے اختیاری ہے اور ایک عجیب سرشاری جس سے بے نیازی کی ہزار دنیائیں جنم لیتی ہیں۔ پچھلی تین صدیوں کے ادب میں ایک ویرانی، ایک بے سروسامانی، منفی قناعت اور انسان اور عالم بیزاری کی ہیبتناک فضا چھائی نظر آتی ہے (ادبی تاریخ کے اعتبار سے غالب اور پھر اقبال نے ایک نئی ادبی فضا، پیدا کی جس سے یہاں بحث نہیں ہے) یہ فرق کہاں سے آیا، میرے اس اشارے کی تائید یا تنقیص مقصود ہو تو ایک طرف رومی، عطار، سنائی، حافظ، سعدی اور اس سے آگے بڑھ کر رابعہ بصری کے اشعار کو ایک طرف رکھئے اور دوسری طرف صائب، بیدل وغیرہ کا سرسری مطالعہ کر لیجئے۔ ان دونوں کے درمیان ملک محمد جائسی کی "پدماوت" رکھ دیجئے۔ یوں محسوس ہوگا کہ ایک روایت ملک محمد جائسی پر ختم ہوئی اور جس کی ابتدا رومی اور عطار وغیرہ نے کی تھی وہ بڑی گمبھیر اور تحیر انگیز ہے۔ مختصر الفاظ میں یہاں دید کی طلب ہے، مشاہدۂ حق کی بے تابی ہے اور یہی طلب اور بے تابی ایک طرف تو تزکیۂ نفس کی جانب رہنمائی کرتی ہے تو دوسری طرف ایک والہانہ انداز میں دنیا سے انسان کو بے نیاز بنا دیتی ہے۔ یہ بے نیازی مقصد نہیں اور نہ منزل ہے بلکہ نتیجہ ہے بے تابانہ طلبِ دید اور مشتاقی کا۔ یہ بے نیازی جس کا انجام "ترک" ہے سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ "ذوقِ دید" کا آفریدہ ہے۔ یہ دنیا سے ایک دنیا بیزار کا

فرار نہیں ہے بلکہ طالب کا آگے کی جانب اور بلندی کی منزل تک سفر کے عزم کا نتیجہ ہے۔ دنیا تعلقوں سے غائب ہونے لگتی ہے اور اسی لئے فرار کا سوال کہاں! یہ تو ایک سفر ہے جس کا انجام اور جس کی منزل "ذات" ہے! پھر یہ بھی کہ ذہن میں شک ہے اور نہ الجھن۔ یہ ترک "جان و دل را جانبِ دلدار کن" کے مطلبے کا جواب ہے۔ یہ سفر ترک سے شروع نہیں ہوتا بلکہ طلبِ دید سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور ترک بے اختیاری کا دوسرا نام بن جاتا ہے۔ اسی بے اختیاری میں قیامت خیز اختیار پیدا ہوتا ہے۔ یہی ترک اس فقر کو بیدار کرتا ہے جس کی منزل آخر وہی ہے جو "وجود" کی... منزلِ اول ہے۔ جہاں اول اور آخر ایک ہو جاتے ہیں "وہی" اول ہے جو آخر ہے اور وہی جو "ظاہر ہے" باطن ہے۔ اسی وحدت میں وہ "قدرت" پنہاں ہے جو ختم کو دوں کو ڈھا دیتی ہے لیکن اس کے برخلاف ویرانی اور بھیانک بے سرو سامانی کی فضا وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں "ذوقِ دید" سے سفر کا آغاز نہیں ہوتا اور جہاں "عشق" خضرِ راہ نہیں بنتا بلکہ سفر کا آغاز ایک پہلے سے طے شدہ بے معاشی سے ہوتا ہے اور "منزل" اسی آغاز کے اطراف گھومتے رہنے کا نام بن جاتی ہے۔ یہیں ترک ایک رسم کا دوسرا نام ہے اور یہیں محض بے معاشی انجام کار نظر آنے لگتی ہے۔ وجود کا ایک سلسلہ "ذوقِ دید" اور "عشق" سے شروع ہوتا ہے اور کئی واجبات تخلیق پاتے ہیں۔ ایک دوسرا سلسلہ ہم شروع کرنا چاہتے ہیں محض ترک سے جہاں "ذوقِ دید" اور بے تابانہ "طلبِ ذات" نہیں ہے، اور پھر جو واجبات جنم لیتے ہیں "کفر و ایمان" کی بحث میں الجھ جاتے ہیں۔ ایک غریب تماشائی یہ سوچنے لگتا ہے کہ

"جز سخن کفرے و ایمانے کجاست"

یہی فرق ہم اگلے اور پچھلے دور میں محسوس کرتے ہیں۔ پہلا دور کیوں جالسی پر ختم ہوا۔ اس پر بھی غور و فکر ضروری ہے۔ اور اسی کے ساتھ انبساط و سرور کی فضا بھی ختم ہوئی۔

یہاں گفتگو کیلئے ادب کا صرف وسیلہ اختیار کیا گیا ہے۔ بات جو بیان کرنا ہے وہ صرف یہی ہے کہ سفر کی منزل ہی سفر کے آغاز کے انداز کو متعین کرتی ہے۔

میرا مقصد خود اپنے ایک مضمون کے اس مختصر اقتباس سے یہی ہے کہ ہم اس "رمز" کے ذریعہ پیامِ امامنا مہدی موعود علیہ السلام کو سمجھ سکیں۔ کسی بھی رمز کے ذریعہ حقیقت تک رسائی ممکن ہے۔ یہیں رمز اور خدا کی نشانیوں (آیات) کے، جو بے شمار ہیں، ربط کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ —————— ●●

متبادل نظامِ اقدار کی ضرورت

ادیانِ پیغمبران میں جسم اور روح کی ناقابلِ حل دوئی کا تصور نہیں ہے۔ اسلام نے خصوصاً اس دوئی کے تصور سے جو مشرق نظام ہائے روحانی میں رائج تھا سختی سے مخالفت کی ہے۔ اسی لئے جسم کے ضروری مطالبات کی تکمیل کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ یہی مطلب ہے اس بات کا کہ اسلام میں رہبانیت کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید نے روح کو من امر ربی سے تعبیر کیا۔ یعنی یہ کہ اس کا ربط عالم امر سے ہے اور جسم کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ انسانی وجود عالم امر اور عالم خلق کا مشترک نقطہ ہے۔ اس وجود میں یہ دونوں عوالم ملتے ہیں اور اسی لئے انسانی وجود باعث رحمت ہے اور اس کا احترام لازمی ہے۔ عالم اسلام کے مشہور صوفی مفکر ابن عربی نے اسی بات کو اس انداز سے بیان کیا "کل موجود مرحوم" (فصوص الحکم، فص ادریس) یہ ایک اہم انقلابی تصور ہے۔ ربوبیت کی شان یہی ہے کہ ہر 'موجود' کی حفاظت ہو اور ہر 'موجود' اس عالم میں اپنا 'مقام' اپنے استعداد کے مطابق حاصل کرے۔ 'موجود' تجلی ربانی سے باقی رہتا اور اپنے استعدادات کی تکمیل کرتا ہے لیکن اس کا دوسرا اور اہم رخ یہ ہے کہ 'موجود' خصوصاً 'انسانی وجود' اپنے آپ کو واقعی مستحق رحمت بنائے اور 'عالم خلق' کے لئے مرحوم ثابت کرے اور بحث کو مختصر کرنے کے لئے یہاں ایک سوال اٹھ سکتا ہے اور یہ کیسے ہو اور کس طرح 'انسانی وجود' 'عالم خلق' کے لئے مرحوم ثابت ہو۔ اس سوال پر اگر گہری نظر سے غور کریں تو یہاں ایک ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'انسانی وجود' اپنے آپ کو محض 'عالم خلق' کا مکین تصور کرے یا محض 'عالم امر' کا یا واقعی معنوں میں ایک ایسا نقطۂ اتصال بنے۔ جہاں 'عالم برتر' کے مطالبات 'عالم کمتر' کے مطالبات کے تابع بن جائیں۔ یہ نقطۂ اتصال ایسا نہیں ہے جس میں دونوں عوالم ایک ہی حیثیت رکھتے ہوں بلکہ ایک ایسا نقطۂ اتصال ہے جہاں ایک عالم 'عالم برتر' ہے اور دوسرا 'عالم کمتر یا عالم زیریں'۔ 'انسانی وجود' اپنی 'مرحومیت' سے محروم ہو جاتا ہے جہاں 'عالم زیریں' کے مطالبات 'عالم برتر' کے مطالبات پر حاوی ہو جاتے ہیں اور انسان 'عالم خلق' میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔

اور بجائے اس کے 'حافظ شیرازی' کی زبان میں 'طائرہ صدرہ نشین' کے لقب کا مستحق ہو، زمین میں اپنے قدم پوری طرح پیوست کر دیتا ہے اور اپنے پروں کو کاٹ دیتا ہے۔ اس طرح 'پرواز' سے اپنے آپ کو محروم کر لیتا ہے۔ 'ذوقِ پرواز' سے محرومی، خود فراموشی اور خدا فراموشی کے مترادف بن جاتی ہے۔ ذوقِ پرواز کی تکمیل کے کچھ تقاضے ہیں اور سب سے اہم تقاضہ یہ ہے کہ انسانی فرد، اپنے آپ کو 'عالمِ خلق' کا مکیں تصور نہ کرے بلکہ 'عالم امر' سے اپنا ربط قائم کرے اور اس کو استوار بنانے کی ہر طرح کوشش کرے۔

اس کوشش کا ایک پہلو 'ذکر دوام' ہے۔ ذکر دوام، محض ایک اعصابی عمل نہیں ہے۔ نہ یہ محض ایک ذہنی کوشش ہے بلکہ یہ ایک رویہ ہے جو ایک انسانی زندگی میں ایک "رہنما رویہ" بن جاتا ہے۔ یہاں 'عالم خلق' سے رشتہ ٹوٹتا نہیں بلکہ استعداد کی تکمیل کے لئے 'زمین' فراہم ہوتی ہے۔ اب اس وقت دنیا کا جو حال ہے وہ 'عالم' میں کھو جانے کا ہے۔ اسی کو عام زبان میں دنیا کے مطالبات کے غالب ہو جانے کا نام دے سکتے ہیں۔ چاہیں تو اس رویہ کو محض مادی عالم سے مربوط ہو جانے کے برابر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب مشکل ہے کہ 'انسانی وجود' مادی عالم سے حیاتِ ارضی میں اپنا ربط توڑ نہیں سکتا۔ ربط نہ توڑتے ہوئے عالم مادی کا نہ ہو جانا 'ذوق پرواز' کو برقرار رکھتا ہے اس کے لئے ظاہر ہے کہ مروج اقداری نظام کے برخلاف ایک متبادل اقداری نظام کی ضرورت ہے۔ جہاں 'دنیا میں وجود' دنیا میں غرق ہو جانے کے مترادف نہ ہو اسی لئے 'ترک کی قدر' اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ ایک متبادل اقداری نظام میں جس کو موجودہ تہذیب کے اقداری نظام کے بالمقابل پیش کیا جا سکے "ترک کا تصور" بنیادی بن جاتا ہے۔ موجودہ تہذیب میں قبضہ گیری اور مادی اسباب کے حصول اور وسائل تک مکمل رسائی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ایک انسان کی قدر و قیمت کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ وہ کیا ہے بلکہ یہ کہ وہ کتنی اشیاء اور کتنے مادی اسباب و وسائل تک رسائی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قبضہ گیری کی کوئی حد نہیں ہے۔ انسان اپنے وجود کی حدیث کو اس انداز سے بھی لامحدود بنا سکتا ہے کہ وہ حد سے بے نیاز ہو جائے۔ زمین میں قدم کو پیوست کرتا جائے اور ماوراء سے اپنی آنکھیں بند کر لے۔ اس پس منظر میں حضرت امامنا مہدی موعود علیہ السلام کے اس ارشاد پر غور کرنا ہے کہ 'ترک دنیا، ترکِ حبِ دنیا ہے اسی ترکِ حبِ دنیا کے اطراف اقدار کا ایک نظام تعمیر کیا

جا سکتا ہے جس میں اہمیت اسباب و وسائل کی مقدار کو نہیں بلکہ انسانی شخصیت کی گہرائی اور اس کے شعور کی توسیع کو حاصل ہوگی۔ اسباب و وسائل شعور کو اس طرح محدود کر دیتے ہیں کہ شعور ان کے اطراف ہی گھومنے لگتا ہے شعور کی توسیع کا سب سے بنیادی اصول یہ ہوگا کہ شعور "وجودِ لامحدود" کو اپنا مرکز بنائے اور اس "وجودِ لامحدود" کے مشاہدہ پر اپنی معنویت کا دار و مدار رکھے اور اسی کو اپنی قدر و قیمت کا معیار بنائے اس منزل پر یہ ضروری نہیں ہوگا کہ "عالم خلق" سے یکسر رشتہ منقطع ہو بلکہ مطالبہ صرف یہ ہوگا کہ "عالم خلق" "عالم امر" کا تابع بن جائے۔ جب بحث اقدار کے متبادل نظام کے متعلق ہو تو یہ بھی ضروری ہے کہ ہم تعلیمات کے جوہر شناس بن جائیں اور وہ ظاہری اطوار اور اعمال کے نظام کی جو ایک خاص تاریخی ماحول سے متعلق تھا، نئی تعبیر کریں۔ اگر ایسا نہ ہو تو "ترکِ دنیا" بھی ایک رسم بن سکتی ہے۔ "توکل" بے عملی اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے کے مترادف ہو سکتا ہے "ذکر" محض ایک اعصابی عمل بن سکتا ہے اور ان کے اطراف ایک نظام اقدار تشکیل نہیں پا سکتا۔

آج ضرورت اس بات کی نہیں ہے کہ زندگی کے تمام نئے تقاضوں کی نفی کی جائے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تقاضوں کو وہ قطعیت نہ دی جائے کہ اقدار سے بے نیاز ہو جائیں دوسرے لفظوں میں دنیا سے یکسر منہ موڑ لینا ممکن نہیں لیکن دنیا میں غرق ہو جانے اور گم ہو جانے کے خطرہ کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ نئی تہذیب اور دورِ حاضر ان تمام خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ انسانی شخصیت ہر قدم پر ہوس کا شکار بن سکتی ہے اور ہوس خواہش جائز کا روپ اختیار کر سکتی ہے۔ ترک ہوس اسی وقت مٹتی ہے جب "موجود" وجودِ مطلق سے اپنا ربط قائم کرنے اور اس ربط کو "ربطِ مسلسل" کا رنگ دینے کی کوشش کرے۔ جس لمحہ "موجود" وجودِ محدود سے جسے عرفِ عام میں دنیا کہتے ہیں، اپنا ربط قائم کر لیتا ہے وہ ایک خطرہ مول لیتا ہے۔ زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اس خطرے کو مول لے لیکن شعور کے اس عالم میں کہ یہ ایک خطرہ ہے اور میں ایک گہرے غار کے قریب کھڑا ہوں جس میں کسی بھی لمحہ گر سکتا ہوں۔ آج کے دور کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس خطرہ سے بے خبر ہوتے جا رہے ہیں اور بے خبری کا عالم یہ ہے کہ "دین دار اور دنیا دار" کا فرق مٹتا جا رہا ہے۔ دین دار کا تکبر بسا اوقات دنیا دار کے تکبر سے زیادہ

پُرخطر ہوتا ہے کیوں کہ وہ ایک "شعورِ کاذب" کا شکار بن جا سکتا ہے۔

حضرت امام مہدی موعودؑ نے اسی تکبّر سے انسان کو آزاد کرنے کی تعلیم دی ہے۔ یہی سب سے بڑی آزادی ہے کیوں کہ آزادی کا حصول، ممکن نہیں ہے جب تک کہ زلیت اعلیٰ روحانی قدروں کی روشنی سے منور نہو۔ یہی مفہوم ہے اس دعا کا جو ہمارا "نصب العین" ہے۔ "ربّنا آتنا فی الدّنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ" اب مرکزی سوال یہی ہے کہ کیا ہم موجودہ دور میں اقدار کے ایک ایسے متبادل نظام کی تشکیل کر سکتے ہیں؟ دنیا کی رہنمائی، اس تشکیل کی طلب گار ہے۔

اس مختصر مضمون میں صرف چند اشارے ہیں۔ اہل نظر سے توقع ہے کہ وہ ان پر توجہ دیں گے۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

ایک بات

ایک مقام پر حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا کہ "ہم کوئی نیا مذہب نہیں لائے ہیں۔ ہمارا مذہب خدا کی کتاب اور محمد رسول اللہؐ کی اتباع ہے"۔ ایک دوسرے مقام پر آپؑ نے فرمایا کہ "ہم بصیروں اور محققوں کا مذہب لائے ہیں"۔ ان دو بیانات میں کوئی تضاد تو نہیں ہے۔ لیکن سننے والوں کو الجھن ضرور ہو سکتی ہے (یوں مذہبی بیانات میں باہمی تضاد کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ خود صحائف آسمانی کے مختلف بیانات میں ظاہری تضاد نظر آتا ہے۔ منطق کے تضاد کے قانون کا مشکل ہی سے مذہبی صحیفوں پر اطلاق ہو سکتا ہے) اس الجھن کو دور کرنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہوگا کہ ہم مذہب بصیران کو ایک نیا مذہب قرار نہ دیں اور اس طرح امام علیہ السلام کو صوفیاء کرام اور اولیاء اللہ کی صف میں کھڑا کر دیں اور پہلے جملہ کا مطلب یہ لیں کہ آپ کا منشا اہل سنت کے راستے پر لوگوں کو چلانا تھا۔ اس طریقہ سے الجھن بھی دور ہو جاتی ہے اور مخاطب بھی خوش ہو جاتے ہیں (اس دور میں اشیاء کی طرح خیالات کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے اور اشیاء کے بازار کی طرح خیالات کا بازار بھی ہے جہاں خریدنے والوں کے مذاق اور اُن کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے اسی لئے اشیاء کے بازار میں گاہکوں کی اکثریت کا اور خیالات کے بازار میں "جمہور" کا خیال رکھا جاتا ہے) لیکن گہرے طریقہ پر سوچنے والوں کی الجھن دور نہیں ہوتی۔ اگر صرف اتباعِ رسولؐ کا پیغام پہنچانا تھا اور صوفیاء کرام کے افکار اور اذکار کی ترویج کرنی تھی تو پھر اتنے ہنگامہ کی کیا ضرورت اور پھر آج بھی یہ شور کیوں ... ؟ کیا تاریخِ اسلام کے کئی اکابر جیسے الغزالی، ابوالحسن الاشعری، احمد بن حنبل، ابن تیمیہ ایک طرف اور دوسری طرف جنید بغدادی، قشیری، ہجویری اور پھر ابن عربی جیسے عظیم لوگ کافی نہ تھے؟

اور پھر بعد کے دور میں شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ نے بھی تو یہی مشن اپنایا تھا۔ جزیرۃ العرب میں اتباعِ رسولؐ کے مسئلہ پر عبدالوہاب نجدی نے ایک تاریخی تحریک شروع کی جس کی

آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اسلام کی تقریباً تمام عصری تحریکیں جیسے سلفیہ اخوان المسلمین مولانا مودودی کی تحریک کا جوش و خروش یہ سب عبدالوہاب نجدی کی صدائے بازگشت ہیں۔ اگر اسلام کی مجموعی تاریخ ایک سند ہے تو پھر ان سب تحریکوں پر یا کسی ایک تحریک پر ایمان لانا پڑے گا۔ دوسری طرف تجدد پسند علماء نے ابن خلدون کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے خود مہدیؑ کے عقیدے پر اتنی بھاری بھرکم بحث کی ہے کہ امت کا ایک اچھا خاصا حصہ اس عقیدے کو جزو ایمان نہیں سمجھتا۔ مستشرقین کے زیر اثر اور ان کی تحقیقات کی روشنی میں احادیث پر پھر سے تنقید شروع ہو گئی ہے اور آج کے ذی عقل احادیث کو اتنی اہمیت دینے پر تیار نہیں ہیں جتنا کہ آج سے پہلے لوگ تیار تھے۔ اس طرح الجھنیں اور بڑھ جاتی ہیں اور معصوم ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے! ایک راستہ یہ ہے کہ ایمان کو عزیز رکھیں اور ان بحثوں سے دور رہیں۔ لیکن یہ دور آوازوں کا ہے اور آنکھوں کے ساتھ کانوں کو بھی مصروف رکھنا پڑتا ہے۔ اتنی آوازیں آتی ہیں کہ کسی ایک آواز پر توجہ دینا آسان نہیں۔ پھر اس الجھن کو دور کیسے کریں!

تفصیل اور گہرائی میں جانے سے پہلے یہ سوچیں کہ کیا ان دو بیانات میں مذہب کا لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے — یہ سوال کٹھن نہیں ہے۔ پہلے بیان میں فقہی مذاہب کی طرف اشارہ ہے اور ان مخاطبین کے لئے یہ بیان ہے جو فقہی مسائل کو دین کی جان سمجھتے تھے اور آج بھی سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں انبیاء علیہ السلام اور پھر اولیاء اللہ اور علماء کی اس لئے تلاش ہوتی ہے کہ اپنے معمولی دنیوی مسائل اپنی عقل کی روشنی میں حل نہیں کر سکتے اور یہ ان کا تصور ہوتا ہے کہ مذہبی عمل اور دنیوی عمل اسی طرح مختلف ہیں جیسے ایک سکہ کے دو رخ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ کم از کم انسانوں کا یہ گروہ بھولا بھالا سہی، لیکن نیک نیت ہوتا ہے اور اپنے محدود اعمال کو قاعدے اور قانون کی روشنی میں انجام دینا چاہتا ہے۔ ایک اور گروہ بھی ان مسائل میں الجھا رہتا ہے اور وہ ہوتا ہے ان لوگوں پر مشتمل جو خدا اور اپنے نفس دونوں کو خوش رکھنا چاہتا ہے — یہ گروہ با اثر افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور اس لئے فقیہ اور عالم اس گروہ سے قریب رہتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ان دونوں گروہوں نے اسلام کو ایک الجھا ہوا قانونی مذہب بنا دیا۔ اس کے کئی نتائج نکلے، ان میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ لوگ زیادہ سے

زیادہ احساسِ گناہ کا شکار ہونے لگے. خلوص اور طمانیت قلب کے ساتھ نماز ادا کرنے سے زیادہ نظر اس پر رہنے لگی کہ کتنے موقعوں پر سجدۂ سہو لازم آتا ہے اور کب کب نماز ٹوٹ جاتی ہے. نماز میں خیال آگیا کہ شائد کہنیوں تک پانی پہونچ نہ سکا تھا اور ساری نماز خلش کی نذر ہوگئی" ان مسائل کی بناء پر رفتہ رفتہ اسلام میں عقیدے کی درستی سے زیادہ ظاہری عمل کی درستی پر زور دیا جانے لگا۔ یہی بات ہندومت میں بھی پیدا ہوئی اور اس نے "برہمنیت" کو جنم دیا۔ اسلام میں مذہب اور سیاست کے سیاسی اتحاد نے (مذہب اور سیاست کی سطح پر بھی اتحاد ہو سکتا ہے اور سیاست کی سطح پر بھی، بدقسمتی سے تاریخ اسلام میں دوسرا واقعہ رونما ہوا). فقہ کو بنیادی اہمیت دیدی (اس کا ایک تمدنی نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کا ایک پیچیدہ ترین قانونی نظام وجود میں آیا) اور اسلامی سماج میں فقہاء نے سب سے اہم مقام حاصل کر لیا، (شائد اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی مسلمانوں کے سماج میں ایک سیدھے سادھے خدا رسیدہ بزرگ کے مقابلے میں فتویٰ دینے کا حق رکھنے والے مولوی کی زیادہ عزت ہوتی ہے) علم دین، فقہی مسائل کا علم بن گیا اور عوام پر فقہاء کی گرفت مضبوط ہوگئی ـــــ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ امام علیہ السلام کے پہلے بیان کا حصہ دین کو فقہ سے آزاد کرنا ہے. (آزاد کرنے کا مطلب بے نیاز کرنا نہیں ہے ان دو الفاظ میں بنیادی فرق ہے) اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ فقہی مسائل کی چھان بین میں تقویٰ کو اہمیت دی جائے. یہاں ایک بات عرض کرنی ہے، اور یہ بات مرکزی اہمیت رکھتی ہے کہ تقویٰ کا فیصلہ جماعت نہیں کر سکتی، احکام الٰہی کی روشنی میں فرد کو کرنا ہوتا ہے. جماعتی مذہب ایک طرح کا پنچایتی مذہب ہوتا ہے. (فقہاء کا راج پنچایتی راج سے کم نہیں ہوتا اور پنچایتی راج کے نتائج معلوم) جماعتی مذہب کی زندگی گزارنے والے دراصل اپنے ہمسایہ کو مطمئن رکھنا چاہتے ہیں، نہ اپنے آپ کو اور نہ اپنے خدا کو ـــــ یہ بات معنی خیز ہے کہ امام علیہ السلام نے جہاں یہ باتیں بیان فرمائیں وہیں یہ بھی فرمایا کہ آپ کے دور میں مذہب (اپنے اصلی مفہوم میں) مجذوبوں میں باقی رہ گیا تھا. (مجذوب وہ ہوتے ہیں جو جماعتی مذہب "بسر" نہیں کرتے). جماعتی اور ادارتی (INSTITUTIONALISED) مذہب، مذہب کے اصلی مقصد کی نفی کرتا ہے یعنے انسان کو خدا سے دور کر دیتا ہے اور خدا سے انسان کی

اجنبیت کو بڑھا دیتا ہے۔ خدا نے انسان کی مابعد الطبیعیاتی "غیریت" وجودی غیریت میں بدل جاتی ہے۔ اور خدا" ایک ایسا "غیر" بن جاتا ہے جہاں تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ 'غیریت' کی اس دیوار کو فقہا اور "قانون دان" اس حد تک اونچا کر دیتے ہیں کہ انسان اپنی "شہ رگ" سے بھی دور ہو جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی عمل کا نتیجہ تھا اور پیمبرانہ مذاہب کی منطق کا لازمی نتیجہ — پیغمبر بحیثیت پیغمبر خدا کے احکام کو انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ لیکن خود پیغمبر کی شخصیت اس پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ خدا سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ صرف اس کے الفاظ ہی کا نہیں بلکہ اس کے منشاء کا علم رکھتا ہے لیکن پیغمبر کی حیثیت سے اس کا منصب خدا کے پیغام کو پہونچا دینا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ وہ اپنے دور میں اپنی نبوت کو اپنی ولایت پر (یا خدا سے اپنے ذاتی تقرب پر) افضل رکھتا ہے۔ حالانکہ خود اس کی نبوت خدا کے منشاء سے اس راست علم پر موقوف ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کے گروہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے علم کے سرچشمہ سے دور رہے؟

اگر پیغمبرانہ مذاہب ہی اصل دین ہیں تو پھر یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ انہی احکام تک اپنی رسائی رکھیں جو انھیں پہنچا دیئے گئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو قانون کے اختلاف کی بناء پر پیدا ہونے والے گروہوں میں بٹے ہوئے رکھیں لیکن ایسا ہے تو پھر اس حکم کا مقصد کیا کہ لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا ولو شاء اللہ لجعلکم اُمۃً واحدۃ ولکن لیبلوکم فی ما اتٰکم فاستبقوا الخیرات۔ الی اللہ مرجعکم جمیعاً فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون ٥ ۔ (سورۂ مائدہ آیت ۴۸) اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شریعتوں کا اختلاف "خیر" کا اختلاف نہیں ہے۔ شریعتیں نیکیوں کو نہیں بانٹتیں۔ اور پھر اعظم ترین خیر کیا ہے۔؟ اور اگر مختلف شریعتیں "خیر" کو منقسم نہیں کرتیں، تو ظاہر ہے کہ ایک ہی شریعت سے پھوٹنے والے مختلف فقہی مکاتب اور آراء خیر کو کیسے محدود کر سکتے ہیں۔ منشاء خداوندی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل دین، خیر کے منبع تک پہونچتا ہے؛ اور یہی اصل سوادت ہے۔ وہ عظیم المرتبت انسان جنھیں ہم پیغمبروں کے نام سے یاد کرتے ہیں، ایسے ہی لوگ تھے جو

اس سعادت کے مالک تھے۔ ان کے مذہب کو اپنانے کا مطلب یہی ہے کہ اس سعادت تک پہونچنے کی کوشش کریں اور بالآخر پہونچ جائیں۔ یہی مذہب بصیران ہے اور یہی مطلب ہے اس بیان کا کہ ہم کوئی نیا مذہب نہیں لائے ہیں، اتباعِ محمد رسول اللہؐ بھی یہی ہوگی کہ اس سعادت کو حاصل کریں جو محمد رسول اللہؐ نے حاصل کی تھی۔ ظاہر ہے کہ دو مختلف تاریخی ادوار کے اشخاص ایک دوسرے کی ایسی اتباع نہیں کر سکتے کہ ہر منفرد عمل یکساں ہو لیکن وہ 'عمل' ایک سا ہو سکتا ہے جس پر تاریخ کا اثر نہ ہو۔ اور یہ عمل ہے 'خیر' کے منبع پر ہمیشہ اپنی نظریں جمائے رکھنے کا ـــــ پیغمبر اپنی تاریخ میں حرکت کرتے رہے اور ہمیں بھی اپنی تاریخ میں حرکت کرنا ہے لیکن ایک 'ذات' ایسی ہے جو تاریخ کی پابند نہیں، اور یہی وہ 'ذات' ہے جو حیّ اور قیوم ہے اور جس پر لا تاخذہ سنۃ ولا نوم کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور اسی پر نظریں جمائے رکھنے سے ہم تاریخ میں رہتے ہوئے بھی تاریخ سے اوپر ابھر سکتے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ امام علیہ السلام نے روایتی جملہ نہیں فرمایا یعنے اتباع سنت رسول اللہؐ، آپ نے فرمایا کہ "اتباع محمد رسول اللہ" ایک حدیث ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "لی مع اللہِ وقت"... ـــــ رسول اللہ کا یہی 'وقت' آپ کی زندگی کا سب سے قیمتی وقت تھا، اور اسی 'وقت' آپ وہ توانائی و طاقت حاصل فرماتے تھے، جس کے اثر سے تاریخ کی سمت بدل جاتی تھی۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ محمد رسول اللہؐ صرف دنیا کی زندگی گزارتے تھے اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا کہ آپؐ انسانوں کی دنیا سے بے تعلق تھے، جس شخصیت نے تاریخ کی سمت کو موڑ دیا وہ دنیا سے بے تعلق نہیں رہ سکتی۔ لیکن یہ طاقت اُن لمحات کا اثر تھی جس کے بارے میں آپؐ نے کہا "لی مع اللہِ وقت" یہی آپ کی نبوت کا سرچشمہ تھا۔ اور یہی وہ سرچشمہ ہے جو تاریخ کا پابند نہیں لیکن تاریخ کو اپنا پابند بنا دیتا ہے۔ یہی مذہب بصیران ہے اور یہی ابدی و ازلی مذہب ہے، شریعتوں کے فرق و اختلاف سے بلند، امتوں کی تقسیم سے ارفع اور ساری انسانیت کو یکجا کرنے والا ـــــ انسانیت جغرافیائی لحاظ سے یا لسانی لحاظ سے یا قواعد و قانون کے لحاظ سے متحد نہیں ہو سکتی۔ زمانے، تاریخ، طبائع اور حالات کا فرق ظاہری اعمال کو مختلف کرتا رہیگا۔ لیکن ساری انسانیت 'خیر' کی جستجو کر سکتی ہے۔

اور اپنی نظریں 'خیر' کے منبع کی طرف جا سکتی ہے۔ اسی طرح ساری انسانیت محمد رسول اللہ ؐ کی اتباع کر سکتی ہے۔ یہی راستہ اصل دین کو آسان (یسرٌ) بناتا ہے۔ اور سختی اور تنگی (عُسر) سے نجات دلاتا ہے فقہی اختلافات دین کو تنگ کرتے ہیں اور انسانوں میں اِس ظاہری اعمال کے لئے احساس گناہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن منبع خیر پر نظریں جمائے رکھنے کی تلقین کرنے والا دین' انسانوں کو احساس گناہ سے نجات دلاتا ہے اور روحانی سعادت سے قلوب کو معمور کر دیتا ہے۔ عبدیت اور ربوبیت کے ربط کو اجنبیت کی سطح پر نہیں لے آتا بلکہ ایک ایسے رشتہ میں بدل دیتا ہے جو "عین" اور "غیر" سے بلند ہوتا ہے ... شرک' توحید کا زوال ہے' توحید شرک کی ارتقائی صورت نہیں۔

ایک خط

برادرم ناصر الدین

آپ نے مجھ سے مضمون کی خواہش کی ہے اور وہ بھی میلاد نمبر کیلئے۔ اس خواہش کے ساتھ ایک خوفناک دھمکی بھی تھی کہ اگر اب کی بار میں نے آپ کو مایوس کیا تو مجھے آپ کی دوستی سے محروم ہونا پڑے گا۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ جو کام ابتک میں تے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نہ کر سکا۔ اب آپکی دوستی کی خاطر کر رہا ہوں۔ کہئیے! کیا اب بھی آپ مجھ جیسے گناہگار سے مضمون مانگنے میں حق بجانب ہیں لیکن یہاں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے مضمون لکھنے یا نہ لکھنے سے خدا، خوش یا ناخوش ہوتا ہے؟ یہ بھی انسان کا عجیب تجربہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کو جن کے بارے میں وہ خود قطعی طور پر واقف نہیں ہے۔ خدا کی خوشنودی یا ناراضگی کے موضوع بنا دیتا ہے، ہر بات میں خدا کا نام لینے والے ہمیشہ با خدا نہیں ہوتے، کبھی کبھی انسانی تکبر بھی اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔ خیر! بات دور جا پڑی۔ اب مضمون نہ لکھوں تو آپکی دوستی جیسی نادر شئے سے محروم ہو جانے کا اندیشہ، لکھوں تو یہ اندیشہ کہ خلق کہیں گمراہ نہ ہو جائے۔ واقعی معاملہ سخت ہے، اور جان عزیز۔ "جان صرف یہیں" عزیز نہیں" "وہاں" بھی عزیز ہے! نورحیات کے میلاد نمبر کے لئے کوئی ہلکا پھلکا یا دقیق ادبی مضمون موزوں نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی برائے نام ہی سہی نیم فلسفیانہ مضمون روانہ کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ اس "بزم" میں "رندانِ بلانوش" ہی آنے کی ہمت کر سکتے ہیں اور یہاں صورت حال یہ ہے کہ "جام" سامنے دھرے ہیں اور ہمیں اپنی "تشنگی" عزیز ہے۔ "تشنگی" کا احساس بھی ہے اور "قربتِ جام" کا ادراک بھی زندگی کا المیہ اسی احساسِ تشنگی اور "ادراکِ قربت" ہی میں پنہاں ہے تشنہ لب اپنی پیاس کا حال سنا سکتا ہے لیکن اس قسم کی "گذارشِ احوالی" دوسروں کیلیے علم پہنچانے کے برابر تو نہیں تحقیقی مضامین، میں نے آجتک لکھے نہیں اور نہ تحقیق کی تکنیک سے واقف ہوں پھر میرا ذاتی خیال یہ بھی ہے کہ "مذہبی تحقیق" (یہاں تحقیق سے مراد "ریسرچ" ہے) مذہبی حس کو بیدار

کرنے کے بجائے قریب قریب مردہ کر دیتی ہے۔ پہلے ہی میری "مذہبی حس کونسی بیدار ہے کہ "تحقیق" کے دام میں الجھ کر اس کو مزید خطرہ میں ڈال دوں۔ "علم کلام" سے طالب علمی کے زمانے ہی سے طبیعت جڑ نہ سکی سیرت اور سوانح نگاری کبھی میرا فن نہ رہا۔" اب واقعی یہ آپ جیسے کرم فرماؤں کی زیادتی نہیں تو اور کیا ہے کہ مجھ سے نااہل سے مضمون کی خواہش فرماتے ہیں اور یہ بھی اس اصرار کے ساتھ کہ جیسے میرا مضمون نہ لکھنا، پڑھنے کے فن سے واقف لوگوں پر ظلم سے کم نہیں۔ چند دنوں سے میرا یہ احساس قوی ہوتا جا رہا ہے کہ موجودہ دنیا میں مذہب کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے سب سے موثر ذریعہ یہ ہے کہ مجھ جیسے "اہل مذہب" زیادہ سے زیادہ اپنی زبان بند رکھیں۔ کم سے کم اپنے قلم کو حرکت دیں۔ صرف وہی لوگ اپنی زبان کھولنے اور قلم کو حرکت دینے کے مستحق ہیں جن کی نگاہ اگر "زلزلۂ عالم افکار" نہ ہو تو کم از کم ایک سماگت سمندر میں ایک ہلکا سا ہی سہی، مگر تموج پیدا کرنے کے قابل ہو۔ اب تو باتوں کی اتنی زیادتی ہے کہ "جز سخن کفرے و ایمانے کجاست" پوچھنا پڑتا ہے جب کفر و ایمان کا معیار صرف "سخن" بن جائے تو آپ ہی سوچئے کہ مذہب کا مستقبل کیا ہوگا؟ مذہب کے مستقبل کو "دشمنانِ مذہب یا مذاہب" سے اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ مجھے "حاملانِ مذہب" سے نظر آتا ہے۔ "دشمنانِ مذہب کو ہتھیار کون فراہم کرتا ہے۔ ان کی "عقل حیلہ جو" سے زیادہ مجھ جیسے اہل مذہب کی "بے بصری" اس بات پر غور فرمائیے کہ کیا مجرد لفظ یا لفظوں کے ایک مجموعے میں اتنی طاقت ہے کہ انسان کی ابدی زندگی کو بنانے یا بگاڑنے کا باعث بنے۔ سچ پوچھئے تو الفاظ علامتیں ہیں ان سے اعلیٰ تر اور برتر حقائق کے اظہار کیلئے معمولی سی حقیقت بھی لفظ کے مقابلہ میں اعلیٰ تر درجہ رکھتی ہے اور پھر جب سوال اعلیٰ ترین حقائق کا ہو تو اپنے عمر کا بے ساختہ اظہار کرنے لگتا ہے۔ اسی لئے "مشاہدۂ حق" کا بوجھ انسانی لغت برداشت نہیں کر سکتی۔ غالب نے غلط نہیں کہا تھا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

"بادہ و ساغر" کی اصطلاحوں یا پردوں میں بھی اعلیٰ ترین مشاہدۂ حق کا اظہار نہیں ہو سکتا جبتک الفاظ کسی نہ کسی اعتبار سے اظہار کا ذریعہ رہیں۔ سمجھئے کہ مشاہدۂ حق اعلیٰ ترین سطح تک نہیں پہونچا۔

جب مشاہدۂ حق اس منزل پر پہنچے جہاں موضوع و معروض کا امتیاز باقی نہ رہے اُس منزل پر انسانی زبان اور اس کی لغات دم توڑ دیتی ہیں زبان کی زندگی کا دار و مدار موضوع اور معروض کے فرق اور فاصلے پر ہے۔ یہی موضوع اور معروض گرامر کے SUBJECT - PREDICATE بن جاتے ہیں۔ قصہ مختصر مذہب اگر انسانی زندگی میں کوئی معنی و مفہوم رکھتا ہے تو اسی وقت جب وہ انسان کو اس اعلیٰ ترین مشاہدۂ حق کیلئے تیار کرے۔ اب رہا علم کلام کا یہ مسئلہ کہ ایسا مشاہدہ "ممکن" بھی ہے کہ نہیں واجب تو بعد کی بات ہے، مشاہدہ کے عدم امکان سے زیادہ علم کلام کی بے بضاعتی کا آئینہ دار ہے۔ اگر انسان کی قسمت میں حقیقتِ مطلق کا وہ عرفان نہیں ہے جہاں معروض اور موضوع، برترین موضوع SUBJECT میں ظاہر ہو سکیں تو پھر انسان کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ انسانی عقل کبھی اتنی مکتمی نہیں رہی کہ وہ نرے دنیا کے معاملات میں اپنی رہنمائی نہ کر سکے اگر صحائف آسمانی صرف قوانین آسمانی ہیں تو پھر دنیوی اعتبار سے ترقی یافتہ انسان کیلئے صحائف آسمانی کسی نہ کسی منزل پر اپنی افادیت کھو دیں گے۔ دنیوی ترقی کی رفتار جب تیز ہوتی ہے تو انسانی زندگی میں "قانونی خلا" پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ظاہر اور باطن میں اس کی ادنیٰ اور اعلیٰ سطحوں میں اس کی روح اور اس کے جسم میں فاصلے بڑھنے لگتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کے قدم تو زمین پر رہیں لیکن اس کی نظروں کو "سوئے عرش" بلند کر دیا جائے۔ اب اس منزل پر "قانونی نظام" انسان کی اس "پروازِ نظر" کو تیز تر کرنے کے لئے ذریعہ کا کام دیتا ہے۔ شریعت "فنائے بشریت" کا ذریعہ بن جاتی ہے، فرد و جماعت کے اختلاف کو رفع کرتی ہے اور انسان کی ادنیٰ بشریت جہاں وہ "اسیر انائے ادنیٰ" رہتی ہے۔ دوسرے "اناؤں" کا لحاظ کرنے لگتی ہے اور انسان میں ایک اعلیٰ درجہ کی تہذیب یا احترامِ آدمیت پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مذہب کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ انسان "احترامِ آدمیت" کے مرحلہ پر رک جائے۔ یہ صرف "عدل" کا مقام ہے لیکن صرف عدل کے مقام پر رک کر عدل ممکن نہیں ہوتا سچا عادل تو وہ ہے جو "عدل" کے مقام سے گذر جائے اور "احسان" تک پہونچنے کی لگاتار جدوجہد کرے اسی لئے "عادل مطلق" صرف خدا ہے اور انسان بھی صفتِ عدل سے اُسی وقت متصف ہو سکتا ہے جب وہ اعلیٰ تر سطح سے جو اس کے لئے سب سے بڑی سطح ہے اپنے اور اپنی نوع کے لئے عدل کے حصول

کی کوشش کرے. اس لئے سچا مذہب "اخلاقی شعور" کے اجاگر کرنے پر رک نہیں جاتا. مذہبی سطح اخلاقی سطح سے بلند تر ہے بلکہ یہ اخلاقی سطح کی نفی کرتے ہوئے احسان کی اعلیٰ ترین سطح پر "عدل" کو ابھار دیتی ہے. مذہبی زبان میں ہم جسے شریعت کہتے ہیں وہ اصل میں یہی اخلاقی سطح ہے جو اگر مقصود بالذات بن جائے تو خود اخلاقیات کی نفی کر دیتی ہے. شائد اسی لئے قرآن مجید نے "عدل" کو تقویٰ کا مترادف نہیں قرار دیا بلکہ یہ کہا کہ "ھو اقرب للتقویٰ" وہ تقویٰ سے قریب تر ہے شریعت عدل تک پہونچاتی ہے جہاں ادنیٰ بشریت فنا ہوتی ہے لیکن "انا" اور "حقیقت" کا فصل ابھی باقی رہتا ہے. اب آگے کی منزل یہ ہے کہ یہ فصل دور ہو اور یہی "تقویٰ" یا عبادت کی آخری منزل ہے جہاں صرف سچا مذہب پہونچا سکتا ہے وہی مذہب مطلق معنے میں سچا ہو سکتا ہے جو اس منزل تک پہونچانے کی ذمہ داری لے اور اسی منزل کو انسانی زندگی کی منزل بنائے. اسی منزل پر انسان تمام "حسنات" کو حاصل کرتا ہے اور زندگی کے کرب اور اس کے اضطراب سے جس سے بڑی جہنم کا تصور ممکن نہیں نجات حاصل کرتا اور اپنے "انا" کو اب "نفس مطمئنہ" بناتا ہے. ان سے بلند تر ہو کر وہ "نفس" تنہا ہے نری قانونی زندگی اس کرب اور اضطراب سے نجات نہیں دلاتی اس لئے "ایمان" بغیر مشاہدہ حق کے ممکن نہیں. اسلام ایمان اور احسان کے مرتبے برحق لیکن یہ مرتبے آغاز سفر کے ہیں. ترتیب سے دیکھئے تو ایمان اسلام کے بغیر ممکن نہیں لیکن اندر سے دیکھئے تو اسلام ایمان تک نہ پہونچے تو وہ اسلام ہی کہاں رہا. اس طرح ایمان کے ایمان بننے کے لئے احسان کی منزل تک اس کی رسائی ضروری ہے. اسی حقیقت کو اس اصول کے ذریعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہر شئے اپنے آپ کو اسی وقت پہچانتی ہے جب وہ اپنی حدوں سے آگے گذر جائے اور اپنے سے اعلیٰ کی طرف پہونچنے کی کوشش کرے اشیاء کی فطری حدیں اشیاء کو مقید کر دیتی ہیں. اور اس قید سے رہائی کے لئے ان حدوں سے گزرنا پڑتا ہے ادب اور آرٹ کی دنیوی سطح پر سوچئے تو انسان اپنی ذات کا بہتر عرفان دوسرے سے محبت میں حاصل کرتا ہے. اسی لئے بعض صوفیاء نے مجاز کی محبت کا یکسر انکار نہیں کیا لیکن ادب اور آرٹ کی یہ سطح زیست کے اضطراب کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتی ہے. اس کا مداوا نہیں کر سکتی. نری تنہائی کے اضطراب اور ایک "دل غمزدہ" کے اضطراب میں زمین اور آسمان کا فرق ہے. اسی روشنی میں دیکھئے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

مذہب، صرف "سخن" نہیں "عمل" ہے لیکن اہلِ مذاہب نے "عمل" کے مفہوم کو اس حد تک تنگ کر دیا کہ مذہبی عمل ایک طرح کا سماجی عمل بن گیا۔ مذہبی عمل وہ ہے جو انسان کو اس کے ادراک کی اعلیٰ ترین منزل تک پہنچانے میں اس کی مدد کرے۔ مذہبی زندگی کی قدر و قیمت کا انحصار اسی "عمل" پر ہے اہلِ شریعت عمل کی اہمیت جتانے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن عمل کو صرف بشری زندگی کی اصلاح کیلئے محدود کر دینے میں وہ عمل کی اندرونی قدر کو گھٹا دیتے ہیں۔ سچا مذہبی راستہ وہی ہو سکتا ہے جو اس فصل کو دور کر سکے جو مذاہب کی تاریخ میں "شریعت" اور "طریقت" کی دو متبائن اصطلاحوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے "ظاہر" اور "باطن" کی اسی کشمکش اور اسی تناؤ میں مذاہب کی انقلاب آفرین طاقت ٹوٹ جاتی ہے آج کی دنیوی کشمکش میں یہ تناؤ بہت زیادہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ سچ پوچھیئے تو آج کا انسان خود اپنے کمالات سے جو واقعی محیر العقول ہیں، باہر، کمال کا متلاشی ہے اس لئے وہ زمینی فضا، کے حدود کو توڑنے کی فکر میں ہے۔ اس متجسس انسان کے ذوقِ جستجو کو کم کئے بغیر اسے نئی راہیں سمجھانا ہے آج کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سائنس اور روحانیت کے بُعد کو کم کیا جائے۔ وہی کشمکش، جو ایک مخصوص مذہب کی تاریخ میں شریعت اور طریقت کی کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی آج پوری انسانی زندگی میں سائنس اور روحانیت کی کشمکش میں ظاہر ہو رہی ہے مستقبل میں وہی مذہبی شعور باقی رہ سکتا ہے جو اس کشمکش کو اس طرح حل کرے کہ یہ دونوں انتہائیں ایک نقطہ پر مل سکیں، مجھے یقین ہے کہ مذہبی شعور اس چیلنج کا مقابلہ کرے گا اور سائنس کی روحانی طاقت یا سائنس کے "روحانی متن" کو محسوس کرے گا۔ جس لمحہ مذہبی شعور "ذکر" اور "فکر" کے فاصلے کو مٹائے گا وہ سائنس کو روحانیت کا پیغام پہونچائے گا اور بے جان روحانیت کو ایک قوتِ متحرکہ عطا کرے گا۔

برادرم ناصر الدین! میں نے، نہ جانے کتنی باتیں آپ کو لکھ دیں، مقصد یہ تھا کہ اظہارِ معذرت کروں لیکن ہائے اظہارِ معذرت میں کئی باتیں کہہ گیا۔ شرمندہ ہوں کہ خود میرا عمل اس معیار سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میل دور ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ میرا پیشہ تدریس ہے اور آج کے مدرس میں (خواہ وہ مکتب کا مدرس ہو جدید کالج کا) اور شاعر میں کوئی خاص فرق نہیں۔ قرآنِ مجید نے شاعر کی یہ خصوصیت

قرار دی ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں "۔ یہاں نفس شاعری کی تنقیض سے زیادہ میرا خیال ہے قرآنِ مجید نے شعر کی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ شاعر سے اپنے عمل میں رہنمائی حاصل نہیں کرتے اور اسی لئے بڑے دل رکھنے والے عارفوں نے شاعروں کو ہمیشہ معاف کیا ہے۔ شاعروں کی ذات "مردود" ہو تو ہو ہر ایک شاعر کا کلام تو "مردود" نہیں ہوتا۔ ادیب اور ہنر مند سے آپ یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ مسلسل فن اور ہنر کی تخلیق کرتا رہیگا لیکن ایک "دیندار" آدمی سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ اس کی نظر "زلزلہ عالم افکار" ہو۔ دنیا میں مذہب کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے اب زیادہ "مذہبی علم" کی نہیں بلکہ ایسی "نگاہوں" کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہی "میکدوں" میں ایسا "میخوار" موجود ہو۔ میرے ان بہکے ہوئے خیالات کو بس یوں سمجھئے کہ یہ ایک "تدلیس" سے تعلق رکھنے والے فرد کی بری عادت کا اظہار ہے کہ وہ ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ اظہارِ خیال کر ہی دیتا ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں "خدا دنیا کو مدرسین سے بچائے"

مخلص

عالم خوندمیری

افکارِ پریشاں

جناب شریک مدیر "نورِ ولایت"

آپ نے ازراہ کرم اپنے پرچہ کے میلاد مہدیؑ نمبر کے لئے مجھ سے ایک مضمون کی خواہش کی ہے۔ میں آپ کی اس خواہش کو ٹال جاتا لیکن آپ کی محبت اور آپ کا اصرار اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں بے مروتی کا الزام اپنے سر لوں وعدہ تو میں نے نہیں کیا لیکن خواہش اس حد تک مخلصانہ ہے کہ خلوص پروری کا اقتضاء تکمیل خواہش کے سوا کچھ اور نہیں۔ لکھنے کے لئے بیٹھا ہوں تو غالبؔ کا یہ مصرعہ ذہن میں بار بار گھومتا ہے اور قلب کو پریشان کرتا ہے۔

"در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق" مشکل یہ ہے کہ جام اٹھا لینا آسان ہے لیکن سندانِ عشق کا بار اٹھانا مشکل! دوسرا مصرعہ میرے کام کا نہیں۔ کم از کم فی الوقت! اس وقت جب چہار طرف دیکھتا ہوں تو ہر ہاتھ میں جامِ شریعت نظر آتا ہے خصوصاً ان ہاتھوں میں جنھیں روحانی رشد و ہدایت اور بصیرت افروزی کی شمع روشن رکھنی ہے۔ دوسرا ہاتھ، کچھ خالی خالی نظر آتا ہے۔ یہ صورتِ حال ذرا نہیں کافی حد تک پریشان کن بلکہ مایوس کن نظر آتی ہے۔ ہر سال میلاد مہدیؑ کا اہتمام ہوتا ہے اور رسالے بھی نکلتے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ حضرت امام علیہ السلام کی دعوتِ عشق سنائی نہیں دیتی اور احیائے شریعت کی آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ بیچارہ عشق اس آواز میں دب جاتا ہے۔ اگر کوئی اٹھائے بھی! یہ تو پہلے دیکھیں کہ امت اسلام نے شریعت کو کب فراموش کیا تھا وہ تو شریعت کے سہارے ہی زندہ رہی۔ اگر آمد مہدیؑ کا مقصود صرف شریعت کا احیاء ہوتا تو پھر اس پیغمبرانہ جملے کا مفہوم کیا ہے کہ "بندہ ایک ایسے زمانہ میں آیا ہے جب دین مجذوبوں میں رہ گیا ہے"۔ مجذوب تو اپنے آپ کو شریعت سے بے نیاز کر لیتا ہے۔ بلکہ اصطلاح میں مجذوب تو وہ سالک ہے جو ایک مقام پر رک جائے اور سفر ختم کر دے یا سفر سے گھبرا جائے

جو کچھ بھی ہو وہ شریعت سے اوپر ہو جاتا ہے۔ ظاہر بین نظروں میں نیچے کی منزل پر پہونچ جاتا ہے شریعت کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اسی مضمون میں غالبؔ کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

آوازۂ شرع از سرِ منصور بلند است
از شب روی[1] ماست، شکوہ عس[2] ما

ایک امر اہم ہے غالبؔ نے دوسرے مصرعہ میں دونوں کیلئے "ما" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ منصور تو شب رو ہے اور صاحبانِ شریعت "عس" لیکن کیا یہ معمولی شب رو تھا جس نے جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے کہا تھا۔ "رکعتان فی العشق لا توضوھا الا بالدم" ہو سکتا ہے کہ اس نے جامِ شریعت کو سندانِ عشق پہ توڑ دیا ہو۔ شائد ظاہر بین نظروں میں اس نے کہا تھا لیکن دیکھیں تو سہی کہ شریعت ہے کیا اور اس کے مدارج کیا ہیں اور عشق ہے کیا اور اس کی معراج کیا ہے؟ قرآنِ مجید کے ہر حکم کو امام علیہ السلام فرض قرار دیا۔ اسی لئے پچھلے صاحبانِ شریعت جن ظاہر اوامر کو مستحب قرار دیتے یا فرائض پنجگانہ سے کمتر ٹھہراتے تھے انھیں بھی فرض قرار دیا۔ مثلاً کونوا مع الصادقین یا ذکر اللہ قیاماً و قعوداً الخ۔ آپؑ نے کسی فرض کا اضافہ نہیں کیا صرف قرآن فہمی کی دعوت دی اور بس! پھر شریعت کے بھی تو مدارج ہیں جو ہر مفتی کی مدد کرتے ہیں اور صاحبانِ حاجت کی "مشکل" رفع کرتے ہیں۔ مثلاً واجب (جسے ہم فرض کہتے ہیں انہیں کو واجبات بھی کہا جا سکتا ہے) مباح (یا جائز) مستحب روا اور اس سے ہٹ کر سنت اسی پر فقہ کی عمارت کھڑا ہوئی اور امت کئی "مذاہب" میں بٹ گئی۔ قرآن پڑھیئے تو دلچسپ نکتے نکل آتے ہیں۔ عام انسان سے پوچھیئے تو فرائض یا احکام کی تقسیم یوں ہے، نماز، روزہ۔ حج، زکوٰۃ۔ حالانکہ قرآن نے صلوٰۃ کے ساتھ روزہ کا یا حج کا نہیں بلکہ بیشتر مقامات پر زکوٰۃ کا تذکرہ کیا ہے۔ خیر! یہ بحث دوسری ہے لیکن اہلِ دین کی لڑائی، دلچسپ بات یہ ہے۔ "مباحات اور روا" امور کے بارے میں ہوتی رہی ہے یہاں صرف ایک مثال کافی ہے۔ اسی سے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔ خطبۂ نکاح میں بالالتزام یہ آیت پڑھی جاتی ہے "فانکحوا ما طاب لکم من النساء" ___ اور تسلسل کیلئے یہ بھی حکم کہ وان خفتم الا تعدلوا

---

[1] شب رو، ڈاکہ ڈالنے والے یا شبخون مارنے والے کو کہتے ہیں اور [2] عس، راتوں کا نگہبان یا چوکیدار ہوتا ہے۔

فواحش تھا۔ علماء اور پیشہ ور مفتی صاحبان، شاہداس امر پر متفق ہیں کہ "جواز" تو مطلق ہے اور دوسری آیت ایسے کسی حال میں مقید نہیں کرتی۔ بعض مفسرین کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ تقوے کا مقام ہے اور احتیاط کی دعوت دیتا ہے۔ بات میں بات بنی۔ یہ تقویٰ کیا ہے؟ قرآن نے "الا تعدلوا" کے لفظ استعمال کئے ہیں یعنے اگر تم ڈرو کہ عدل نہ کر سکو۔ عدل کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے اور صاحبان نفاذ کے لئے عدل ضروری ہے لیکن یہی قرآن کہتا ہے۔ "اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ" عدل بہر حال تقویٰ سے قریب ہے لیکن تقویٰ کے مترادف نہیں۔ "اقرب" کا مطلب یہی ہے کہ عدل کی منزل سے گذرنا ہے اور "تقویٰ" اس سے قریب ہے۔ عدل سے تقویٰ اور تقوے سے عدل تک سفر برابر جاری رہتا ہے۔ یہ سفر باطن سے خارج تک یا باطن سے ظاہر تک کی جانب ہے۔ ذہنی رویہ سے عمل کی جانب روحانی منزل سے جسمانی عمل تک لیکن پھر ایک بار قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ عدل سے اونچا مقام "احسان" ہے اسی لئے قرآن عدل اور احسان دونوں کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ اب بات سمیٹ لوں اور صرف ایک سوال کروں کہ کیا "احسان" کے بغیر "عدل" ممکن ہے؟ آسان لفظوں میں، کیا وہ جس نے احسان کی منزل تک سفر نہیں کیا "عادل" ہو سکتا ہے؟ عدل سے نیچے گر جانا آسان ہے لیکن احسان کے مقام سے عدل کرنا مشکل نہیں، بلکہ میرا خیال تو یہ ہے وہی عادل ہو سکتا ہے جو "محسن" ہو، اسی لئے دور رسالت میں رسولؐ عادل تھے اور علیؓ عادل۔ اس لئے کہ مقام احسان پر فائز تھے۔ میں نے علیؓ کا نام صرف اجدادی محبت سے نہیں لیا ہے، بلکہ مجھے ہمیشہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کا جملہ یاد آتا ہے۔ "لولا علی فھلک عمر"۔ یہ ایک ایسے ہی موقعہ پر تھا جب عمرؓ کو عدل کرنا تھا۔ بہر حال فیصلہ کن بات یہ ہے کہ صرف مقام عدل پر رہ کر عدل کرنا آسان نہیں احسان تک پہنچنا ضروری ہے۔ اب احسان کیا؟ حدیث جبرئیل ہماری مدد کرتی ہے۔ احسان کا پہلا مقام یہ ہے کہ جیسے ہم خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ پہلا مقام یہ ہے تو "منزل" کیا ہوگی؟ احسان ایک سفر ہے نہ ختم ہونے والا۔ ایک کٹھن مہم ہے ہمیشہ جاری رہنے والی، یہی "سفر" جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ رسول اللہؐ نے ایک مرتبہ فرمایا "ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی جانب رواں ہیں۔" صاحبان شریعت مباحات اور جواز کی اہمیت پر بحث کرتے ہیں اور بیشتر فتاوے اباحت کی منزل پر رک جاتے ہیں۔ اس لئے کسی نے یہ بھی خوب

دے دیا کہ "دارالحرب" میں سود جائز ہے لیکن کسی مقام کو دارالحرب قرار دیکر نہ تلوار اٹھائی اور نہ ہی ہجرت کی۔ اب صرف احیائے شریعت کا مفہوم کیا ہے۔ فرائض پر اصرار یا مباحات کی فہرست کی ترتیب ایک اور مثال اپنے ہی گروہ کی لیجئے۔ مہینے میں بارہا محافل عقد نکاح میں شرکت ہوتی ہے۔ اس گروہ کو یہ کیا ہو گیا کہ "از روئے شریعت" حالت حضر میں چھ مہینے اور حالت سفر میں ایک سال عورت کے ہاتھ میں اس کا اختیار لوٹا دیا۔ اس میں عالیت کا مفہوم تلاش کرنا ہے جہاں عبادات میں سختی عالیت ہے وہیں انسانی معاملات میں نرمی ہمارا گروہ "مقام احسان" پر تھا اور اسی لئے عورت کو یہ اہم اختیار سونپا۔ کاش! عالم اسلام اس کو اپنا لیتا اور بیشتر مسائل حل ہو جاتے۔ یہ صرف ایک مثال تھی لیکن اہم سوال یہ ہے کہ شریعت کی آواز اتنی بلند کیوں ہوتی ہے کہ "ایمان" اور "احسان" کی بات دب جاتی ہے یا دوسرے لفظوں میں ایمان اور احسان پر اسلام کیوں غالب ہو جاتا ہے۔ (حدیث جبرئیل) اسلام مقام شریعت ہے۔ قرآن مجید کی وہ آیت دیکھئے "قالت الاعراب لقد آمنّا الخ" انہیں حکم ہوا کہ وہ ("سلمنا") کہیں یعنے شریعت یا سماجی نظام کے دائرے میں داخل ہوئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنی ذاتی اور انفرادی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے سب ہی کو ایک دوسرے کا مساوی قرار دیتے ہیں حالانکہ قرآن بار بار یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا الف، ب کے برابر ہے۔ کیا وہ جنھوں نے "اعلیٰ تر مقام" سے شہادت کا فیصلہ کیا۔ ایسی "شخصیت" کے مساوی وہ کیسے ہوں جنھوں نے شہادت کا تماشہ دیکھا۔ اور بعد میں اظہار افسوس کیا۔ (کسی کی جان گئی اور آپ کی ادا ٹھہری) میں عمومی بات کر رہا ہوں، اشارہ کسی تاریخی واقعہ کی طرف نہیں ہے۔ امام علیہ السلام نے ایمان اور احسان کی منزلوں کو قریب تر کر دیا۔ اسی لئے فرمایا "بنیائی ایمان ہے" کم از کم طلب ہو تو اسلام سے احسان کی جانب سفر جاری رہتا ہے۔ یہ سفر ہی اصلی ایمان ہے۔ اسلام ایک انقلابی پیام ہے سماج کی تبدیلی کا اور عدل کے قیام کا لیکن سماجی انصاف کے ارضی نظریئے روح کی جانب نہیں دیکھتے۔ اسلام ایمان اور احسان کی منزلوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ایسے افراد کی تخلیق کرتا ہے جو احسان کے مقام سے عدل کریں نام نہاد نفاذ اسلامی کے پیام ناکام ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ صرف اسلام کی منزل پر رہتے ہیں اور آواز شریعت "سر منصور" سے بلند ہو جاتی ہے۔

امام علیہ السلام کا پیغام، سماجی انقلاب کی رد نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے ایسے افراد کی تربیت کرتا ہے جو "ترکِ حبِ دنیا" کی منزل سے گذریں اور نوعِ انسان کی دمسازی کریں۔ ترک دنیا صرف ایک رسم نہیں ایک عادت نہیں، بلکہ یہ بھی ایک روحانی سفر ہے۔ ان پر بھی واجب، جو دنیا میں ہیں۔ اور کارِ دنیا میں مصروف بلکہ ان کے لئے واجب تر۔ کیوں کہ وہی دنیا میں عدل قائم کر سکتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں "جن کی امیدیں قلیل، جن کے مقاصد جلیل" "مقصدِ جلیل" کیا ہے؟ امام علیہ السلام سے جواب حاصل کیجئے "ذات" اب یہاں مواعظِ حسنہ ہماری مدد نہیں کرتے بلکہ طلب ہی ایک بھٹکا ہوا راہی جواب دیتا ہے۔ "ذات را بے پردہ دیدن زندگی است۔" (اقبال) امام علیہ السلام آئے اور ان کا پیام پھیل گیا۔ اب ایک گروہ میں محدود نہیں رہا۔ "ذات را بے پردہ دیدن" کی آواز گونجی اور روحانی دنیا کی فضا پر چھا گئی۔

اشارے کافی ہو گئے۔ ایک اور اشارہ اگر گستاخی نہ ہو! اقبال نے شکایت کی تھی "تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند" کیا ہم آج ایسے مضطرب فرد کو اپنے گروہ کی سیر کرا سکتے ہیں؟ یہاں بھی خُمِ بادے کا زور ہے اور "جام" خالی۔ شاعر بھی کیا کہہ جاتا ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

اب سندانِ عشق کی ضرورت ہے! یہ اہل ہمت کا کام ہے، ورنہ شیوخ اور ملا کافی ہیں اب نگہ کو زلزلۂ عالمِ افکار بننا ہے۔ اور امام علیہ السلام کا پیام اسی زلزلہ انگیزی کی دعوت دیتا ہے۔

ایک مکالمہ

اثنائے گفتگو میں یہہ بحث چھڑ گئی کہ "ان ممالک میں جہاں آفتاب مہینوں نہ نکلتا ہو، نمازوں کے اوقات کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے؟ یا روزے کیسے رکھے جا سکتے ہیں؟ کیوں کہ ان دونوں فرائض اسلام کا تعین آفتاب کے نکلنے یا ڈوبنے پر منحصر ہے۔ اور اب جبکہ مساعیٔ انسانی نے نئی نئی وادیاں اپنے رہنے کے لئے تلاش کر لی ہیں۔ کرۂ ارض سے ہٹ کر بھی جا بسنے کے انسان منصوبے باندھ رہا ہے تو ایسے مقامات پر کیا طریقۂ عبادت اختیار کرنا ہوگا۔"

پروفیسر خوندمیری نے کہا

"ایسے مقامات پر ذکر سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے "والذکر اللہ اکبر" کی حقیقت یہاں پر سمجھ میں آجاتی ہے جبکہ صوم و صلوٰۃ کے اوقات کا تعین ناممکن ہو تو ذکر ہی ایک ایسا طریقۂ بندگی ہے جس کو ہر جگہ اور ہر وقت، اپنایا جا سکتا ہے۔" اور پھر فرمانے لگے "میں نے یہ بات باہر کے ایک صاحب فکر سے کہی تو انہوں نے اس کو بیحد پسند کیا۔"

حقیقت یہہ ہے کہ دقیق پروفیسر نے ایک دقیق بات بتلائی۔

نوٹ: شریک گفتگو۔ جناب الحاج معین الدین شیخ امام صاحب مرحوم سابق صدر مرکزی انجمن مہندیہ جناب سید عبدالکریم صاحب اسحاقی، جناب سید علی یرتر صاحب اور جناب الحاج ناصرالدین صاحب سابق مدیر "نور حیات"

هشت جنّت گر دهندت سر بسر

تو مشو راضی از آنها در گذر

عالی همت باش و دل با حق بنه

تو همای قاف قربی رو بلند

مولانا رومؒ

کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا :——

فریدالعصر

حضرت مولٰنا سید محمود مجتہدی صاحب
(مولوی فاضل۔ سجادہ دائرہ زمستانپور و متولی حظیرہ مشیرآباد)

پروفیسر ڈاکٹر عالم خوندمیری، حسینی سیّد، دنیائے علم وحکمت کے مایۂ ناز مفکر و محقق، دریائے عقل و دانش کے دُرِ بے بہا تھے۔ آپکی علمی خدمات و افکار عالیہ کی نشر و اشاعت کا دائرہ حدودِ ہند سے متجاوز ہوکر ایشیاء کے علاوہ براعظم یورپ و امریکہ کی یونیورسیٹیوں تک پہنچ چکا تھا۔ بڑے بڑے فلاسفر آپکی علمی تحقیقات کے آگے جھک جاتے تھے۔ مرحوم کی ساری زندگی، مسائل علمیہ کی تحقیق و موشگافی میں گزر گئی۔ نفس الامر کی اصل غرض و غایت تک پہنچ جانا، حقائق پر گرے ہوئے دبیز پردوں کو چاک کرنا، آپ ہی کے بس کی بات تھی۔ اس خصوص میں عصرِ جدید کے جلیل القدر مفکرین نے بھی اسبات کا ضرور اعتراف کیا ہے کہ آج انھیں آپ کا کوئی مثیل و سہیم نظر نہیں آتا۔

آپ کا اٹھ جانا، بلاشبہ ساری دنیا کے متلاشیانِ علم و حکمت کا نقصانِ عظیم ہے۔ جودتِ طبع، ذکاوتِ ذہن، خوش اخلاقی و ملنساری آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کے ذاتِ گرامی میں ایسے صفاتِ حمیدہ تھے کہ جو بھی آپ سے ملتا، آپ کے علم و اخلاق کا مداح و گرویدہ ہو جاتا۔ دنیائے دوں آپ کی نگاہوں میں ہیچ تھی۔ روپے پیسے کو کبھی بھی قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ سینہ مانندِ آئینہ صاف و شفاف طبعیت میں کبر و غرور، فخر و ناز کا شائبہ، لباس اور رہن سہن میں کوئی ٹھاٹھ یا کرّ و فرّ نہ تھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے۔

اپنی ذات میں علم و دانش کا ایک بحرِ ذخّار رکھنے کے باوجود، اس پر کبھی فخر نہیں کیا۔ یہی ایک بڑے انسان کی علامت ہے۔ بعض گوشوں سے مرحوم پر تنقیدیں بھی کی گئیں۔ لیکن کبھی آپنے ان تنقیدوں تبصروں پر کوئی تبصرہ، اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی مخالفانہ ردِّ عمل ظاہر فرمایا۔ لوگوں پر آپ کی زبان قطعاً بند تھی۔ جب کسی سے مصروفِ گفتگو ہوتے، نہایت سنجیدگی و متانت کے ساتھ افہام و تفہیم کا فرض انجام دیتے۔ طبعیت میں ترش روی و سخت کلامی کو مطلق دخل نہ تھا۔ عفو و درگزر خاصۂ فطرت تھا۔ حق گوئی میں بے باک تھے۔ جب کسی جلسۂ عام میں حق گوئی پر اتر آتے تو کسی کی رو رعایت کئے بغیر حقائق کا

اظہار فرماتے لیکن آپ نے کبھی بھی ہاتھ یا زبان و قلم سے کسی کی دل آزاری کی اور نہ ہی حقوق العباد و حقوق الناس کی ادائی میں کسی قسم کی کوتاہی کی۔ مخلوق خدا پر بڑے رحم کھاتے۔ گھر بنایا اور نہ جس گھر میں رہے اس میں از قسم سونا چاندی ایک ماشہ بھی رکھنا گوارہ کیا۔ ایک متوکل کی طرح زندگی بسر کی۔ ہزار ہا روپیہ کمایا، لیکن مال و دولت کو کبھی دل میں جگہ نہ دی۔ وہ طبعی طور پر فقیر منش تھے۔

غرض، مرحوم، ملّت مہدویہ کے فرید العصر و عظیم انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین! ۔ و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

ایک عظیم مفکّر

حضرت مولانا سیّد نصرت عالم صاحب
(مولوی کامل، سجادہ دائرہ اہل گوڑہ و مسجد جونپور، مشیر آباد.

عظیم مفکر ڈاکٹر سیّد عالم غوندمیری کا شمار، ان دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے دنیائے علم و دانش میں اپنی ایک انفرادیت، اپنا ایک علحدہ لب و لہجہ اور اپنی ایک علحدہ فارم اور سامانِ وجود کے ذریعہ، اپنا ایک خاص مقام بنایا۔ اور اس طرح جدیدہ ادب و نقد پر بھی اپنے نام ثبت کئے۔

اساسی طور پر، عالم صاحب فلسفہ کے آدمی تھے اور ان کا موضوع بھی فلسفہ ہی رہا۔ مگر انھوں نے اپنی اس فلسفیانہ فکر کا تانا بانا، ادب و فلسفہ، سیاسیات اور تاریخی شعور سے ایسا مرتب مربوط کیا تھا کہ ہزار چشمے اسی سنگ راہ سے پھوٹے۔ اور پھر ان کی تخلیقاتِ فکر بھی انہی متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی رہیں۔ اور یہی کچھ ان کی "متاع لوح و قلم" ہے۔ چونکہ عالم صاحب کا فکری اظہار و ابلاغ منطقی ہوتا تھا۔ اس لئے ان کا تنقیدی لب و لہجہ بھی فلسفیانہ اور منطقی ہی ہوتا تھا جس میں جہاں ان کی حجیت و برہان کی کاٹ نفی سے تراوش کرتی تھی، تو وہیں ان کے استدلال کا "اگلا قدم" اثبات ہی ہوتا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی فکری رو کا ساتھ دینے والے چند ہی لوگ ہوا کرتے تھے کیونکہ عالم صاحب ایک ایسے عالم تھے جن کا عوام یا سماج سے رشتہ و رابطہ بقدر "جلوہ یک نظر" والا معاملہ جیسا تھا۔

عالم صاحب کا قلم حیات و کائنات کے مسائل کا احاطہ کرتا تھا۔ اور ان مسائل کو سلجھاتا بھی تھا کبھی سوز و ساز رومی کی صورت میں تو کبھی پیچ و تاب رازی کی طرح۔ مگر ان کی قلم و فکر میں پیچ و تاب تھا بھی تو ایسا کہ جس سے فکر کے دریچے کھل جاتے تھے۔ ان کی فکر میں ایسا ٹھیراؤ یا وقوف نہیں تھا جو ان کے لہجہ کو قطعیت یا یقین آفرینی سے ہمکنار کرتے ہوئے محکمات کا درجہ دیسکے۔ کیونکہ وہ جو لکھتے یا کہتے وہ اسیات کا غماز ہوتا تھا کہ ان کے ہاں جو کچھ سرمایۂ فکر ہے اس سرمایہ میں سبھی کچھ متشابہات ہی ہیں۔ ان کی فکر بڑی مضطرب اور سیماب پا ہوتی۔ وہ ہر مقام سے مہ نو کی طرح گزر جاتے تھے۔ ان کا ذہن ایک ایسا غیر آسودہ، متجسس و متلاشی ذہن تھا کہ جس کی ابدی حقیقتوں کی تلاش میں صبح کہیں تو شام کہیں ہوا کرتی۔

یہ کائنات جہاں ہر لمحہ ایک صدائے کن فیکون کا عمل جاری و ساری ہے، یہ بھی تو غیر تبدیل نہیں اس کو کہاں وقوف و قرار ہے۔ اشیاء کی فطرت میں بھی تو تغیر ہے اور جب ایک فلسفی حیات و کائنات کے مسائل پر غور کرتا ہے تو اس کا ذہنی رویہ بھی تغیرات و حوادث کا تابع فرمان ہی رہتا ہے۔ اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

شاید یہی بات تھی کہ پروفیسر سید عالم خوندمیری میں بھی ہمیں وہی ایک بات دیکھنے کو ملتی اضطراب و کشمکش کی آفریدہ فکر کی ایک موج مضطرب اور وہی تب و تاب جاودانہ ——————

اقبالیات پر انکی نظر بہت گہری تھی۔ اس موضوع پر ان کو بڑی بصیرت حاصل تھی۔ ہر چند کہ غالبیات کا موضوع بھی ان کی جولانگہ فکر سے خارج نہیں رہا۔ غالب پر بھی ان کے بعض معرکتہ الآراء مضامین نے اردو ادب کی تنقیدی دنیا میں بہت دھوم مچا رکھی تھی۔ اور ان مضامین کی گونج آج بھی سنی جا سکتی ہے۔ پھر یہ کوئی دور کی بات نہیں، کل ہی کی تو بات ہے، عالم صاحب کے مضامین ہمارے سامنے ہیں۔ مگر اقبالیات پر جب بات کرتے تو عالم صاحب کچھ اور ہی نظر آتے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص "زنجیری دو عالم تو رسیدہ ہے"۔ اور عالم کی شخصیت کچھ اور نکھر کے سامنے آتی ہے۔ اور آئینہ در آئینہ نظر آتی ہے۔ ہائے عالم —!

عالم کی شخصیت بھی کتنی دلکش اور کتنی پیاری تھی۔ اقبال نے مرد مومن کا نشان بتایا تھا اور پوچھا تھا کہ مرد مومن کس کو کہتے ہیں؟۔ ہم نے دیکھا ہے۔ عالم نے موت کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا ہے خوف مرگ کی کہیں کوئی جھلک اس کے ہاں نظر نہ آئی ــــ

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　　چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

بلاشبہ ہم نے بعد مردن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی ہے! کیا دلکش مسکراہٹ تھی —— بالکل چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست —— والی مسکراہٹ۔

عالم صاحب میری نظر میں

محمد ابراہیم علی خاں
ڈپٹی کلکٹر ریٹائرڈ

عالم صاحب ہو گئے مرگِ زیست سے آزاد۔ روح و بدن کے رشتے کا کوئی اعتبار نہیں قیدِ جسم سے آزاد ہونے کو روح، موت کے انتظار میں رہتی ہے۔ عالم صاحب کی موت عالم کے آغوش میں کوئی سانحہ نہیں۔ مومن موت سے نہیں ڈرتے اور لذتِ مرگ کے منتظر رہتے ہیں۔ ابدی دنیا کی سمت سفر ان کے پیشِ نگاہ ہوتا ہے۔ دنیا کے دامن میں کتنی زندگیاں جگہ پاتی ہیں۔ اور طلبی پر اس جہانِ فتنہ و فساد سے پردہ کر جاتی ہیں۔ مومن نجات کی آرزو میں جیتا ہے، نجات کی آرزو میں مرتا ہے۔ مومن کی زندگی دنیا رخی نہیں آخرت رخی ہوتی ہے۔ عالم صاحب حقیقتِ حیات سے آگاہ رہ کر زندہ رہے۔ واقف رہ کر مر گئے۔ صاحبِ علم و حکمت طلب کر لیا جاتا ہے تو اس کا کردار و عمل نشانی بنکر دنیا میں رہ جاتا ہے۔ دنیا پتھروں سے بھری پڑی ہے، ہیرے کم دستیاب ہوتے ہیں۔ کسی عالم کے گزر جانے پر ملال اس کا رہتا ہے کہ حیات مہلت عطا کرتی تو اس کی علمیت سے مزید استفادہ کیا جاتا لیکن اللہ تعالیٰ مقدور سے زیادہ کام اپنے کسی بندے سے نہیں لیتے۔ کسی کی ذات سے حیات کی امید باندھے رہنا غیر فطری بات نہیں۔ جانتے ہوئے کہ موت سے نجات نہیں انسان کا ساتھی موت کے ہاتھوں بچھڑ جاتا ہے تو داغِ مفارقت دل کا داغ ہو جاتا ہے۔ وقت کا فاصلہ غم کی شدت کو کم کرتا رہتا ہے اور غم یاد بنکر دل کی گہرائیوں میں پرورش پاتا رہتا ہے۔ غم کو اس دل کی تلاش رہتی ہے جو عظمتِ غم جانتا ہے۔ ایسے ویسے دل میں غم کا گزر نہیں ہوتا۔ عالم صاحب مرحوم کی زندگی کے نشیب و فراز سے لوگ کم واقف ہیں۔ عالم خوندمیری کا

مذاقِ علم ہی عالم صاحب بنا کر رہا۔ عالم خوندمیری ذوق علم سے صداقت کا ناطہ جوڑ کر اپنا مقام پیدا کرنے میں کامیاب رہے تاکہ عالم ان کو عالم صاحب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کرتا رہے۔ عالم صاحب کا شمار ان شخصیتوں میں ہوتا ہے جو اپنی شخصیت کے آپ صورت گر، اپنے کردار کے آپ معمار ہوتے ہیں۔ جس جامعہ سے وہ علم کی نعمت سے سرفراز ہوئے اسی درسگاہ میں علم کی دولت بانٹتے رہے تاکہ سرفرازی علم کا حق یوں ادا ہوتا رہے۔ درس لینے کو سب ہی جاتے ہیں لیکن دینے کو ٹھہر جانا حوصلہ کی بات ہوتی ہے۔ عالم صاحب فلسفی رجحان و رغبت سے بغاوت کر جاتے تو زندگی میں ناکام رہتے۔ عالم صاحب کو فلسفیانہ اندازِ فکر ودیعت ہوا تھا۔ منفرد کو اپنی انفرادیت کا احساس رہنا بڑی بات ہوتی ہے۔ خود ساز انسان دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔ فیضانِ احدیت ہی کے در سے انفرادیت میسر آتی ہے۔ عالم صاحب چلا گئے اور ان کے ساتھ ان کی انفرادیت چلا گئی۔ عالم صاحب کے احباب تسکین عقیدت کی خاطر مرحوم کو مفکر، فلسفی، دانشور کہتے ہیں۔

وہ اک انسان تھے اپنی ذات کی تلاش میں آپ حیراں ضروری نہیں کہ فلسفہ سے ڈاکٹریٹ کرنے والا خود ذرا سفر شمار ہو۔ جب بھی مرحوم سے میرا ربط رہا انہیں فہم و ادراک کی فضاؤں میں پایا۔ عالم صاحب کی شخصیت ہرگز سطحی نہیں کہ سمجھنا آسان رہتا۔ زندگی کی قدروں سے ناآشنا ہوکر لوگ مر جاتے ہیں۔ عالم صاحب خوب واقف تھے کہ زمین پر زندگی دائمی نہیں اور آخرت کی زندگی عارضی نہیں۔

صاحبِ علم تدریس کی ذمہ داریاں قبول کر لیتا ہے تو اس کا فیضانِ درس کبھی کسی درسگاہ کی چار دیواری میں قید نہیں رہتا بلکہ صلائے عام ہوتا ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے۔ اشاعتِ علم کی تمام تر ذمہ داری دوشِ عالم پر رہتی ہے اور اس ذمہ داری کے پورا کرنے میں عالم صاحب سے کبھی کوتاہی نہ ہوئی۔ جب کبھی اور جہاں بھی موقع ملتا علم کی دولت فراخدلی سے بانٹتے نظر آئے تاکہ علم بٹ کر بھی باقی رہے۔ آفتاب اپنی کرنیں لٹاتا رہتا ہے اور متاعِ آفتاب کم نہیں ہوتی — عالم صاحب کو فیضانِ علم کا اک ذریعہ بنا کر پیدا کیا گیا تھا۔ صاحبِ علم کے گزر جانے پر اس کا ثانی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اللہ کی جانب سے سرفرازیاں شخصی ہوتی ہیں۔ عالم صاحب جس عنوان پر

خطبہ سرا رہوتے اپنے خاص انداز میں دعوت غور و فکر دیتے رہتے اور تشنگانِ علم ہمہ تن گوش بنکر سنتے۔ تدریس کی ذمہ داریوں کو قبول کر لینے کے بعد زندگی میں وقت کہاں رہتا ہے کہ لکھا جا سکے۔ تصنیف چھوڑنا عالم صاحب کے مقدر میں نہ تھا۔ عالم صاحب ہمیشہ خطابت کی منزل پر نظر آئے۔ ادیب کے مقام پر نہیں حق کی بات تو یہ ہے کہ عالم صاحب پروردہ فکر صحیح تھے اور بلاشبہ قرآن فہم انسان جس کے قلب و جگر میں اللہ کا خوف ہو اس کی زندگی تعیشات کی گندگی سے پاک رہتی ہے۔ "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا" (۳۵ : ۲۸) یعنے خدا کے بندوں میں سے جو علم رکھنے والے ہیں وہی خدا سے ڈرتے ہیں۔

عالم صاحب کے علم کو فقط دنیا کا علم سمجھنا ہرگز درست نہیں۔ عالم صاحب دین اور دنیا کے علم سے سرفراز ہوئے تھے۔ عالم صاحب کے نزدیک قرآن محض تلاوت کی کتاب نہیں بلکہ کتاب تدبر (مومنون۔ ۶۸) اور کتاب تبلیغ (مائدہ۔ ۶۷) رہا۔ قرآن کے علم کی اشاعت و تبلیغ نزول قرآن کا مقصود اور یہ ذمہ داری اولاً دوش محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رہی (۲۸ : ۸۵) قرآن حکیمانہ کلام ہے اور حکیمانہ کلام کو صرف حکیمانہ غور و فکر سے سمجھا جا سکتا ہے، منطقی مطالعہ سے ہرگز نہیں مرحوم اسلام کا مطالعہ تفکیری زاویے سے کرتے۔ عالم صاحب دین اور دنیا کے رشتہ کو خوب پہچانتے تھے۔ دنیا کا فریب انھیں متوجہ نہ کر سکا اور دین اُن کے ادراک میں حقیقت رہا۔ قناعت جس کی رگ رگ میں بسی ہو، فقیرانہ زندگی کی لذت سے جو آگاہ ہو وہ اسیرِ ہوس، عیش پرست ہو نہیں سکتا۔ عالم صاحب جب بھی نظر آئے راہِ حیات اپنے پاؤں پر طے کرتے نظر آئے۔ ان کا کوئی ذاتی گھر نہ تھا اور نہ ذاتی موٹر۔ تعیشاتِ زندگی کا ان کی زندگی میں کبھی گزر نہ ہوا۔ عالم صاحب جس گھر میں رہے خود کو مہمان جان کر رہے۔ مہمان خانہ عالم میں خود کو مہمان شمار کرنے والا گھر کا مالک بھلا کیوں کر ہوتا۔ عالم صاحب کا مخصوص اندازِ بیان تھا جو بڑی حد تک عام فہم نہیں ہوتا۔ صاحبانِ علم و دانش استفادہ کرتے اور دوسرے تسکینِ سماعت ہی کو فیضِ نشست سمجھتے۔ وہ مختلف انداز میں دعوتِ چشم و گوش دیتے بمقصد یہ ہوتا کہ حقائقِ حیات کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

"اگر تمام حادثات کا سرچشمہ سلسلہ روز و شب ہے تو ظاہر ہے کہ موت ہی حادثات کے اس سلسلہ کا انجام ہے۔ کائنات کا کوئی مظہر موت و حیات کے اس سلسلہ نظام سے مستثنیٰ نہیں" (انسانی تقدیر اور وقت' ڈاکٹر عالم خوندمیری)۔ یہ خیال صرف اس شخص کی زبان و قلم سے نکل سکتا ہے جو سورۂ العصر کی تفسیر سے آگاہ ہو۔ تقدیر اور وقت کے رشتے کو جس سلیقہ سے واضح کیا گیا ہے وہ عالم صاحب ہی کا حق رہا۔ عالم صاحب کی ساری زندگی فکر و نظر کی ارتقائی منزلیں طے کرتی رہی۔ ادراک کی صورت گری ہوتی ہے تو اس منزل پر موت آجاتی ہے۔ اپنا تعارف آپ کروانے والے چہرے دنیا میں کم ملتے ہیں۔ عالم صاحب کا چہرہ عالم صاحب کا تعارف کرواتا اور زبان خاموش رہتی۔ مرحوم نظروں میں سما جانے والی صورت لیکر آئے تھے۔ نام عالم رکھا گیا تو جتنی عالمی شہرت ملنی تھی مل کر ہی رہی۔ عالم صاحب کی رواداری کا جواب نہیں۔ سیاست ان کے گھر گھس آئی تو گوارہ کر لیا۔ بہر آزمائش اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اقتدار و اختیار دے رکھے ہیں تو خدا شناس دوسروں کے اختیارات و معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتے۔ عالم صاحب کی آزاد مزاجی کا ثبوت یہ کہ وہ دوسروں کی آزاد خیالی پر اپنے نظریات کو مسلط کرنا نہیں چاہتے تھے ہر شخص کو درسِ فہم دینا ان کا کام نہ تھا۔

انسان اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوتا جاتا ہے' ترقی کے زینے طے کرتا رہتا ہے تو اس کے وجود میں ہوس کا کبھی گزر نہ ہوا ہو تو ہو جاتا ہے کیونکہ ہوس کے قیام کے لئے ایسا ماحول بڑا ہی سازگار ہوتا ہے نفس کے تقاضوں سے کون مجبور نہیں ہوتا۔ خواہشاتِ نفس کو انسان کیا بنا لیتا ہے نفس منزل اطمینان کی تلاش میں ہو تو تابع فرمان رہتا ہے اور قرآن ہی تو ہے فرامین الہٰی کا مجموعہ فلسفہ کا طالب علم خود صدر شعبہ بن جاتا ہے اور غرور کو نزدیک آنے کی اجازت نہیں رہتی۔ عالم صاحب کی زندگی میں نہ غرور نظر آیا اور نہ انکساری۔ عالم صاحب کے تعلق سے لوگوں کا بدگمان رہنا حیرت کی بات نہ تھی۔ سمجھنے والوں نے ان کو وہ سمجھا جو در اصل وہ نہ تھے۔ عالم صاحب کون تھے سب ہی جانتے ہیں لیکن کیا تھے پہچان آسان نہ تھی۔ فکر و نظر کی دنیا ان کے ادراک میں وسیع تر تھی۔ وہ پابند عنوان نہیں عنوان ان کا پابند رہتا۔ دل آزاری ان کے مزاج میں نہ تھی۔ تشنگانِ علم کی محفل میں وہ پہنچ جاتے تاکہ انسانی دماغوں

علم کی تجلّیات میسر آتی رہیں۔ غور و فکر کے عالم میں کھویا رہنے والا عالم دنیا کی فاسد دلفریبیوں کی سمت کیونکر رجوع ہوتا۔ ان کے خیالوں کی دنیا ان کی دنیا تھی۔ وہ دوست پیدا کرنا چاہتے تھے دشمن نہیں۔ خلیج مٹانا چاہتے تھے پیدا کرنا نہیں۔ عالم صاحب کی مقبولیت بے بنیاد نہ تھی۔ ہر مکتبِ خیال ان کو اپنا سمجھتا۔ دنیا میں بہت کم لوگوں کو ایسی مقبولیت میسر آتی ہے۔ عالم صاحب بہنوں کی محبت سے آگاہ اور بھائی کی محبت سے اجنبی رہے۔ انسان بھائی کی محبت سے اجنبی ہو تو وہ ملال کا مقام نہیں عالم صاحب پیکرِ اخلاق و مروت، مجسمۂ خلوص و محبت رہے۔ عالم صاحب کا پیام محبت تھا جہاں تک وہ پہونچے۔ عالم صاحب ایک شخص تھے اور کہنا پڑتا ہے تھی وہ اک شخص کے تصور سے۔ اب وہ رعنائی خیال کہاں۔

اسرارِ حقیقت کا محرم ہونا تقدیر کی بات ہوتی ہے اور شعور صرف اسی کو عطا ہو جاتا ہے جو رہ کے عالم میں بیگانۂ عالم رہے۔ عالم صاحب ساری زندگی رہ کے عالم میں بیگانہ عالم ہی تو رہے ان کے گرد جو بھی ماحول رہا اس سے بے نیاز۔ ان کا خود اک ماحول تھا جس کے دیکھنے کو نظر درکار ہوتی۔ مفکر کو اپنا انداز فکر و نظر پیارا ہوتا ہے اور فکر و نظر کی توہین کا امکان جہاں ہوتا ہے مثالی ایثار و قربانی کے ذریعہ آبرو کے تحفظ کی سبیل کرنی پڑتی ہے۔ جذبہ و تحمل کے معاملے میں عالم صاحب کو کمال حاصل تھا۔ عالم صاحب کے جادۂ صبر و رضا کی آزمائش کو کئی حادثات گزرے اور عالم صاحب مسکرا کر سہہ لیتے تو حادثات شرما کر رہ جاتے۔

اپنے ہوں یا پرائے عالم صاحب یہی چاہتے تھے کہ انسان قرآن فہم ہو کر قرآن ہی کو خضرِ راہ بنالے عالم صاحب کا علم درحقیقت عالم کیلئے تھا۔ ایسی شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں۔ آدمی کو مادیات کی سطح سے اٹھا کر روحانیت کی سطح پر پہونچانا اسلام کا مقصود۔ انسان زندگی کی اس سطح پر پہنچ جائے جہاں اس کی فکری سطح اور عالمِ حقیقت کی سطح دونوں یوں ایک ہو جائیں کہ امتیاز دشوار ہو جائے۔ انسان ادراک کے زینے طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ فیضانِ الٰہی کا مہبط بن جاتا ہے۔

عارضۂ قلب مرضِ عام ہے لیکن مرضِ خاص ان کی موت کا سبب بنا۔ ملال کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اک انسان اس دنیا سے اٹھ گیا جبر کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اک خدا شناس خدا کے پاس پہنچ گیا۔

مینارۂ نور

ڈاکٹر مغنی تبسم
ریڈر شعبۂ اردو۔ عثمانیہ یونیورسٹی۔
حیدرآباد

گذشتہ نصف صدی میں حیدرآباد کی ثقافتی زندگی میں جن شخصیتوں نے، اپنے افکار و محسوسات کی تابندگی بخشی۔ اسے اجالا اور نکھارا۔ ان میں پروفیسر سید عالم خوندمیری کی ذات ایک مینارۂ نور کے مانند تھی۔ جس کی ضیا بخشیوں سے تین نسلوں نے اکتساب فیض کیا۔ یہ فیض رسانی صرف سرزمین دکن تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کا دائرہ اثر وسیع تر ہوچلا گیا۔ اور برصغیر کے حدود سے گزر کر دیار مغرب کو بھی اپنی احاطت میں لاچکا تھا۔

ڈاکٹر عالم خوندمیری، پہلے پہل ایک نوجوان ترقی پسند ادیب اور ٹریڈ یونینسٹ کی حیثیت سے منظر عام پر آئے پھر فلسفے کے استاد بنے اور مفکر سیاست دانوں کی صف میں نمایاں ہوئے۔ آخری زمانے میں عصر حاضر کے چند گنے چنے ممتاز ماہرین اقبالیات اور معدودے چند اسلامی مفکرین میں ان کا شمار ہونے لگا۔

شعبۂ فلسفہ سے وابستہ ہونے کے سبب وہ پوری طرح علمی اور تحقیقی کاموں میں مشغول ہوگئے تھے۔ انھوں نے مختلف ادبی اور علمی موضوعات پر بے شمار مقالے اردو اور انگریزی میں تحریر کئے۔ کئی قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی۔ ۱۹۶۹ء میں مغربی جرمنی کی دعوت پر وہاں کی یونیورسٹیوں میں اسلامی فلسفے اور اسلامی قانون کا مطالعہ کیا۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی اور جرمن اورینٹیل انسٹی ٹیوٹ اور یونیورسٹی آف کابل جاکر مباحث اور مذاکروں میں حصہ لیا۔ ۱۹۷۵ء میں لیک ثقافتی پروگرام کے تحت مصر گئے جہاں عصری تبدیلیوں اور اسلام کے موضوع پر کام کیا۔ اور مذاکرات میں حصہ لیا۔ ۱۹۷۶ء میں امریکہ کی مختلف یونیورسیٹوں میں لکچر دیئے۔ ۱۹۷۷ء اکٹوبر میں پونہ یونیورسٹی کی خواہش پر "اسلام کے فلسفیانہ پس منظر" پر تین لکچر دیئے۔ ۱۹۷۸ء میں انہوں نے کشمیر یونیورسٹی میں اقبال کے فلسفہ اور شاعری پر چار خطبات دیئے۔ اسی سال سری وینکٹیشورا یونیورسٹی کی دعوت پر اسلام کے

کلاسیکی اور جدید مفکرین" پر ایک کلوکیم میں حصہ لیا۔ کچھ عرصہ کشمیر یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ بعد سبکدوشی، انھیں ICSR نے تین سال کے لئے ریسرچ فیلو مقرر کیا۔

عالم صاحب کے مطالعۂ فکر کے خاص میدان میں سے ایک فلسفۂ مذہب بھی تھا۔ اسلام اور مذہب کے موضوع پر انہوں نے زیادہ تر انگریزی میں مقالے تحریر کئے۔ "مذہب اور وجودی صورتِ حال" مقالہ میں تصورِ مذہب کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عالم صاحب کے خیال میں، دینیاتی اور فقہی مذہب انسان کی داخلیت کو نظر انداز کرتے ہوئے، اس کے اختیار اور آزادی کو سلب کر لیتا ہے۔ دوسری طرف تصوف، الوہی آزادی کے فرق کو فراموش کر دیتا ہے۔ نتیجتاً انسانی آزادی غیر حقیقی ہو جاتی ہے ان کے مقابلے میں وہ پیغمبرانہ بصیرت کو پیش کرتے ہیں، جس کے نزدیک انسان محدود مگر آزاد ہے۔ انسان نے ابھی تک وہ آزادی دوبارہ حاصل نہیں کی، جسے وہ مذہب کے فقہی دور میں گنوا چکا تھا۔ جدید سائنس نے بھی انسان کی آزادی کو محض ایک فریب بنا کر رکھ دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ مذہب انسانی شعور کی بیداری کے فریضہ کو اپنے ہاتھ میں لے اسے الہام کی روشنی مطلوب ہے۔

اقبال کے مطالعہ کے سلسلے میں عالم صاحب، یہ فکر انگیز اور معنی خیز نکتہ پیش کیا ہے کہ اقبال کی فکر ایسے ہی افراد کے لئے ہے جو واقعی "شخصیت" کے حصول کے طلب گار ہیں۔ ان لوگوں کے لئے اس کے میخانہ میں گنجایش نہیں، جو ازل کا سرور حاصل کرتے رہتے ہیں اور جنھیں ابد کی فکر نہیں۔

فلسفہ اور اسلامی فکر کے علاوہ، انھوں نے جدید اردو تنقید کو بھی اپنے رشحاتِ قلم سے سرمایہ دار بنایا۔ وہ ایک فلسفی نقاد تھے۔ ادب کے مطالعے میں وہ تاریخی اور سماجی عوامل کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ اور حسبِ ضرورت اساطیری تجزیئے سے بھی انہوں نے کام لیا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کی تنقید کو فلسفیانہ کہا جا سکتا ہے ان کی ادبی تحریریں کیا بلحاظ اسلوب اور کیا بلحاظ مواد قدر اول کی چیزیں ہیں۔ جن کے مطالعے سے ادب کی نئی بصیرت اور آگہی حاصل ہوتی ہے۔ "غالب اور ہمارے ہم عصر" ن۔م۔ راشد، انسان اور خدا، محالی کی ایک مناجات، جدید شاعری کا بدلتا ہوا محاورہ، ایسے مضامین ہیں، جو اردو تنقید میں انھیں ایک ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتے ہیں۔

عالم صاحب کی فکر مختلف جدید و قدیم نظریات اور فلسفوں سے اثر پذیر ضرور ہے لیکن وہ کسی مخصوص فکر یا نظریئے کے پابند نہیں رہے۔ جہاں تک انسان اور بالخصوص موجودہ عہد کے انسان کے نفسی مسائل کا تعلق ہے، انھوں نے "وجودیت" پسندانہ نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لیا ہے۔ وہ کسی ایسے سماجی یا فکری نظام کے حامی نہیں تھے، جو فرد کی آزادی اور استبداد کو مجروح کرتا ہے۔

ڈاکٹر سید عالم خوندمیری مرحوم کے اٹھ جانے سے علمی دنیا ایک منفرد اور بڑے مفکر و دانشور سے محروم ہوگئی۔

رہِ نوردِ عشق

بجناب سید یعقوب شمیم صاحب
(ایم۔اے اردو) اہلِ دائرہ نو

عالم صاحب کے انتقال سے ہماری فکری، علمی اور ادبی زندگی میں جو خلاء پیدا ہوا ہے، اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ بلاشبہ وہ ایک بلند پایہ فلسفی، علم اور علم کے تقاضوں کو خالصتاً علمی انداز میں سمجھنے اور سمجھانے والے عالم بے بدل اور ایک ایسے شفیق و مہربان استاد تھے کہ جنھوں نے اپنی بے پناہ استعداد علمی کی بدولت فلسفہ، ادب، مذہب اور سیاست جیسے مختلف النوع میدانوں میں اپنی فکر انگیزیوں کی شمعیں فروزاں کی۔ اور آج جب وہ ہم میں نہیں ہیں تو، ان کے سیکڑوں، ہزاروں چاہنے والے، ان کے دوست، رفقائے کار، ملنے جلنے والے، قرابت دار، رشتہ دار اور بیسیوں شاگرد سبھی ان کے کارہائے نمایاں کو یاد کرتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح، عالم صاحب کی پہلو دار شخصیت کا ایک ایک رخ ہمارے سامنے آتا جا رہا ہے۔ مگر عالم صاحب کی شخصیت کا سب سے روشن اور دلنواز پہلو وہ ہے، جس میں وہ ایک عالم یا فلسفی سے کہیں زیادہ، ایک ایسے انسان کی حیثیت سے پہچانے جا سکتے ہیں جو سرتاپا پیکر حلم و اخلاص تھا۔ اپنے تبحر علمی سے بے خبر نہیں بلکہ بے پروا۔ وہ اپنے ہر ملنے والے سے بلا تخصیص عمر و رتبہ کچھ اس طرح پیش آتے اور اس قدر توجہ، انہماک و

دلجوئی سے اس کی بات سنتے اور اس قدر دلنشیں انداز میں اس کا جواب دیتے کہ مقابل کو ان کے آگے اپنی کم مائیگی اور بے بصیری کا ذرا سا بھی احساس نہ ہونے پاتا۔ شائد یہی وجہ تھی کہ مختلف مکاتیبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں نے ان کی شخصیت کے اسی پہلو کے پیشِ نظر ان کی ذات کو اپنے اپنے انداز سے الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ مگر عالم صاحب کے یہی حلیف جب یہ دیکھتے کہ ان کی فکر رسا، ان حد بندیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ؛ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

کی قائل ہے اور آگے ہی آگے بڑھ جانا چاہتی ہے تو، عالم صاحب کے دم بھرنے والے یہی لوگ ان کے حریف بن جاتے اور جھنجھلا کر ان کی شخصیت کو "CONTRAVERSIAL" یا "متنازع" قرار دیتے ہوئے، ان سے پہلو تہی کرنے لگتے تھے۔ اس کے برخلاف، عالم صاحب زمانے کی ان بے اعتنائیوں کی کبھی بھی پروا نہ کی اور ؎

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو ؛ رزم ہو کہ بزم، ہو پاک دل و پاکباز

کے مصداق ہمیشہ اور ہر لحظہ "رہ نوردِ عشق" ہی رہے۔ اور کبھی بھی کوئی منزل قبول نہ کی۔ کیوں کہ وہ ایک ایسے انسان تھے جسے اپنے آپ میں "کمال اور تمام" کو پانے کی جستجو نے عمر بھر سرگرداں رکھا ــــ عالم صاحب نے اپنی تلاش و جستجو کے لئے جو لائحہ عمل بنایا تھا، وہ "قلیل امیدوں اور جلیل مقاصد" والا لائحہ عمل تھا۔ اپنے سفرِ زیست میں، انھوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہ تو وہ ہی خوب جانتے تھے، یا پھر ان کا اللہ جانتا ہے۔ لیکن اس "صاحبِ دل" نے ہمارے لئے اپنا جو فکری اثاثہ چھوڑا ہے، وہ یقیناً خاصہ کی چیز ہے۔

ہمیں پیر و مرشد حضرت سید خدا بخش خوندمیری میانجی صاحب قبلہ مدظلہ کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے کہ حضرت قبلہ نے بڑی کاوشوں سے عالم صاحب کے ان مختلف مقالہ جات، مضامین اور تقاریر کے بکھرے موتیوں کو یکجا کر کے ایک کتابی شکل دی ہے، تاکہ آپ اور ہم، عالم صاحب کی ان فکر انگیز باتوں کو پڑھیں، اُن پر غور و فکر کریں اور اپنی عملی زندگی میں اِن سے استفادہ کرنے کی سعی کریں۔ گویا یہ کتاب ایک ؎

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"

حضرت سید ابوالقاسم تسخیرؔ حیدر آبادی
(اہلِ ہستیرہ)

ساغرِ اخلاص

۱۹۸۳ء

آہ ! عالم خوند میری اہلِ فکر
۱۴۰۳ ھ
راحتِ جاں عہدِ زریں جس کا ذکر
۱۹۸۳ء

بحرِ احساں، نکتہ داں، نکتہ بیں
۱۴۰۳ ھ
شمعِ محفل، خندہ لب، خندہ جبیں
۱۹۸۳ء

صاحبِ فکر و قلم نادر صفات
۱۴۰۳ ھ
گنجِ عقل و صبح بہجت جس کی ذات
۱۹۸۳ء

غنچۂ دل، محسنِ علم و ادب
۱۴۰۳ ھ
خوش صفات و گنجِ دُر عالی نسب
۱۹۸۳ء

شاہ رُتبہ علم نَو علمِ قدیم
۱۴۰۳ ھ
تھے ملے انوار از ربِ عظیم
۱۹۸۳ء

بخشے عالم کو جزا ربِ الحبیب
۱۴۰۳ ھ
صورتِ اوج اس کو خلدِ حق نصیب
۱۹۸۳ء

لوحِ قرآن آیت لاتقنطوا
۱۴۰۳ ھ
کر دعا چپ چاپ اے تسخیر تو
۱۹۸۳ء